انسان اور ایمان

اُستاد شہید مرتضٰی مطہری

Printed By AL-BASIT 021-6606211

دانش گاہ علوم اسلامی

جی۔پی۔او بکس 10 چکوال پاکستان

0332-3329235 E-mail: payamenoorpub@yahoo.com

انسان اور ایمان

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

Albirr Online Libraray

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام جعفر صادق علیہ السلام

اِحْتَفِظُوا بِكُتُبِكُمْ فَإِنَّكُمْ سَوْفَ تَحْتَاجُونَ إِلَيْهَا

اپنی کتابوں کی حفاظت کرو کیونکہ جلد تمہیں اس کی ضرورت پیش آئے گی

(الکافی، ج۱، ص۵۲، ح۱۰، صحیح السند روایت ہے)

آن لائن البرّ اسلامی تحقیقاتی مرکز پاکستان
albirronline.net

انسان اور ایمان

تالیف:

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

المہدی اسلامک سنٹر
اسلامی، علمی، ثقافتی و تحقیقاتی مرکز
متصل مسجد جامع و امام بارگاہ امام الصادقؑ جی-9/2، اسلام آباد
۰۹۲-۵۱-۲۵۰۴۱۴۶ / ۰۹۲-۵۱-۲۸۵۴۰۷۷

دانش گاہ علوم اسلامی
جی پی او بکس نمبر 10 چکوال

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

اے شیعو! ہمارے لیے عزت افزائی کا باعث بنو، بدنامی کا سبب نہ بنو۔

لوگوں سے اچھی باتیں کرو۔ اپنی زبان کی حفاظت کرو اور اسے فضول اور بیہودہ باتوں سے روک کر رکھو

☆☆☆☆☆

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	انسان اور ایمان
صاحب اثر	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ترتیب وتصحیح	اسد بخاری
ناشر	پیام نور پبلیکیشنز
تاریخ اشاعت	2 مئی 2008ء (یوم معلم، یوم شہادت شہید مرتضیٰ مطہری)
تعداد	1000
قیمت	60 روپے
فون	0332-3329235

ہماری جدوجہد کا مقصد

امام حسینؑ نے فرمایا:

بارالہا! تو جانتا ہے کہ ہماری جدوجہد کا مقصد نہ تو حصول اقتدار کے سلسلے میں رسہ کشی ہے اور نہ ہی یہ مال دنیا میں اضافے کی خواہش کے لئے ہے بلکہ صرف اس لئے ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ:

☆ تیرے دین کی نشانیوں کو آشکار کردیں۔

☆ تیرے شہروں میں اصلاح کریں۔

☆ تیرے مظلوم بندوں کو امان میسر ہو۔

☆ اور جو فرائض، قوانین اور احکام تو نے معین کئے ہیں ان پر عمل ہو۔

☆☆☆☆☆

محمدؐ و آلِ محمدؐ کی الٰہی وسیاسی تعلیمات کے فروغ واحیاء کے لئے سرگرم عمل۔

اتحاد بین المسلمین واستحکام وطن کے لئے مصروف عمل۔

منتظرین امام زمانؑ

دانش گاہ علوم اسلامی

آپ اس کاروان میں شامل ہو سکتے ہیں، اپنی مفید آراء کے ذریعے سے آپ قارئین کے آراء ونظریات ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

0332-3329235

منشورِ انقلاب

اے خداوند! چاہے کوئی نہ جانے مگر تو خود اس حقیقت سے بخوبی واقف و آشناء ہے کہ ہم نے تیرے دین کے پرچم کی سربلندی کے لئے انقلاب برپا کیا ہے اور تیرے رسولؐ کی پیروی میں عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے ہم مشرق ومغرب کے خلاف پوری طرح ثابت قدم ہیں اور اس راہ کو طے کرنے میں ایک لمحہ کی کوتاہی نہیں کرتے۔ پس ہم لوگوں کو اپنی بندگی کی راہ کا عاشق و درد آشناء بنا دے اور ہمارے شہیدوں کو اپنی، رسول اکرمؐ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی ولایت کے صاف و پاکیزہ کوثر سے سیراب فرما اور ہمارے انقلاب کو مصلح کل (امام زمانؑ) کے انقلاب سے متصل فرما۔ انک ولی النعم

(بانی انقلاب اسلامی امام خمینیؒ)

حرف آغاز

اے انسان تو سمجھتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا کیڑا ہے۔؟ جبکہ تیرے اندر عالم اکبر سمایا ہوا ہے مولا متقیان امام علیؑ کا یہ مختصر مگر پر مغز جملہ اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ یقیناً انسان اپنی خودی اپنی شناخت سے غافل ہے وہ سمجھتا ہے کہ دوسرے جانداروں کی طرح محض وہ بھی ایک جاندار ہے اور بس یعنی پیدا ہوتا ہے، بڑا ہوتا ہے، کھاتا پیتا ہے، ازدواج کرتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے اور بلاآخر ایک دن دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو شاید اس وقت دنیا میں اکثریت انہی لوگوں کی ہو جو دنیاوی زندگی کو ہی اپنا مقصد حیات تصور کرتے ہیں۔ درحقیقت اس طرح کے نظریات وافکار انسان کا دین اور ایمان سے دوری کا نتیجہ ہے۔ اگر انسانی زندگی سے ایمان کو نکال دیا جائے تو وہ محض مٹی کا ایک جاندار بت رہ جائے گا کہ جو اپنے شخصی فائدے کی خاطر دوسرے ہزاروں انسانوں کا خون بہاتے ہیں۔ بستیوں کو ویران کرتے ہیں اور نخلستانوں کو صحراوں میں بدلتے ہیں۔ لیکن یہ ایمان کی طاقت ہی ہے کہ جو انسان کو کچھ حدود وقیود کا پابند کرتی ہے۔ انسانی زندگی اور انسان معاشرے کو نظم وضبط عطا کرتی ہے۔

استاد شہید مرتضیٰ مطہری ملت ایران کا وہ عظیم سپوت کہ جس کے افکار وکردار کی حرارت سے صدیوں تشنہ علم ومعرفت سیراب ہوتے رہیں گے اور راہ منزل سے بھٹکے ہوئے لوگ استاد شہید کی الٰہی ونورانی تعلیمات کی بدولت ہدایت حاصل کریں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے گزشتہ زمانوں میں راہ منزل سے بھٹکے ہوئے کارواں تاریک راتوں میں چمکتے ہوئے ستاروں سے اپنی صحیح سمت کا تعین کرتے تھے۔ استاد شہید کی شخصیت کا مکمل احاطہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے استاد شہید مطہری کی تعلیمات وافکار نسل آئندہ کے لیے ایک امانت ہیں ان لوگوں کے لیے کہ جو اپنی زندگی قرآن وسیرت اہلبیتؑ کے مطابق گزارنا چاہتے ہیں جو کتاب اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے یعنی انسان اور ایمان وہ اس موضوع پر اپنی مثال آپ ہے۔ ہم اپنی اس سعی وکوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں وہ آپ قارئین کے فیڈ بیک سے معلوم ہوگا۔

مسئول

دانش گاہ علوم اسلامی (چکوال)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسان، حیوان ہی کی ایک قسم ہے، اسی وجہ سے وہ بہت سی چیزوں میں دوسرے جانوروں سے ملتا جلتا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے ان ہم جنسوں سے کچھ مختلف بھی ہے۔ دوسرے جانوروں سے اس کا یہی اختلاف اسے ان سے ممتاز بنا کر اتنی فضیلت اور ارتقاء عطا کرتا ہے کہ وہ لاثانی بن جاتا ہے۔

افکار و تمایلات، دوسرے جانوروں کے مقابلے میں دو ایسے پہلو ہیں کہ جو انسان کو بنیادی اور اساسی طور پر ممیز کرتے ہیں اور جو اس کی ''انسانیت'' کا معیار اور انسانی ثقافت و تمدن جیسی چیزوں کا سرچشمہ ہیں۔ عام طور پر تمام حیوانات اس فضیلت و برتری سے بہرہ مند ہیں کہ وہ اپنے آپ اور بیرونی دنیا کا ادراک کرتے ہیں اور اس سے واقف ہیں اور وہ اسی عرفان و آگاہی کے پرتو میں اپنی خواہشات اور مطالبات کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں۔

تمام جانوروں کی طرح انسان بھی کچھ خواہشات اور تمناؤں کا حامل ہے، اور وہ بھی اپنے علم و معرفت کی روشنی میں ان خواہشات اور مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے علم و معرفت کی وسعت اور پھیلاؤ نیز خواہشات و مطالبات کی سطح کی بلندی کے لحاظ سے انسان دوسرے حیوانات سے مختلف ہے۔

یہی وہ چیز ہے جو انسان کو فضیلت اور بلندی عطا کرتی ہے اور اسی کو تمام جانداروں سے ممتاز بناتی ہے۔

حیوانات کی خواہشات کی سطح اور ان کی معلومات کی وسعت

چونکہ حیوان صرف ظاہری حواس کے ذریعے دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے لہذا ایک تو اس کی معلومات سطحی اور ظاہری ہوتی ہیں اور وہ اشیاء کے اندرونی معاملات اور ان کے داخلی رابطوں کی تہ تک رسائی نہیں حاصل کر پاتا، دوسرے یہ کہ اس کی معلومات فردی اور جزئی ہیں یعنی ان میں کلیت اور عمومیت نہیں پائی جاتی، تیسرے یہ کہ اس کی تمام تر معلومات علاقائی ہوتی ہیں یعنی وہ اس کے رہن سہن کے ماحول میں محدود ہوتی ہیں اور وہ اس کی زندگی سے باہر کے ماحول کا احاطہ نہیں کر پاتیں۔ چوتھے یہ کہ اس کی معلومات فقط حال سے متعلق ہوتی ہیں یعنی زمانہ حال سے وابستہ ہوتی ہیں اور ان کا ماضی و مستقبل سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا، چنانچہ حیوان نہ تو اپنی اور دنیا کی تاریخ سے آگاہ ہوتا ہے اور نہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے لیے کوشش کرتا ہے۔

حیوان، معلومات و آگہی کے نقطہ نظر سے ظواہر، انفرادیت، جزئیت اور اپنی زندگی کے ماحول اور زمانہ حال کی حدود سے باہر قدم نہیں نکالتا، وہ ہمیشہ کے لئے ان چار جیلوں میں مقید ہے اور اگر کبھی ان حدود سے نکل بھی جائے تو یہ علم و معرفت کے سبب یا انتخابی اور شعوری طور پر نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ عمل طبیعت کے قوانین سے مجبور ہو کر غریزہ کے زیر اثر لاشعوری طور پر انجام پاتا ہے۔

حیوان کی خواہشات اور مطالبات کی سطح، دنیا کے بارے میں اس کی معلومات کی وسعت کی طرح کچھ خاص حدود میں محدود ہے۔

۱۔ اس کی خواہشات مادی ہیں۔ کھانے، پینے، سونے، کھیلنے، کودنے یا گھونسلہ وغیرہ بنانے، نیز جنس مخالف سے لطف اندوز ہونے کی حدود سے آگے نہیں بڑھتیں، حیوان معنوی اور روحانی خواہشات، اخلاقی اقدار وغیرہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

۲۔اس کی خواہشات شخصی اور انفرادی ہیں، وہ صرف اپنے مفادات چاہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اپنے بال بچوں کی فکر میں رہتا ہے۔

۳۔اس کے افکار و خواہشات علاقائی ہیں، اور صرف اس کے رہن سہن کے ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔

۴۔اس کی خواہشات حالی ہیں، یعنی ان کا تعلق صرف آج ہی آج یعنی زمانہ حال سے ہے، نہ گزرے ہوئے کل یعنی ماضی سے اس کا تعلق ہے اور نہ ہی آنے والے کل یعنی مستقبل سے اس کا کوئی ربط ہے۔

مختصر یہ کہ (اگر ہم حیوان کے دو ابعاد یا اس کی زندگی کے دو پہلوؤں کا تجزیہ کریں جن کا ایک بُعد ادراک اور دوسرا بُعد خواہشات و تمایلات سے متعلق ہو تو ہم کو معلوم ہوگا کہ) جس طرح کی پابندیاں حیوان کے ادراکی بُعد پر عائد ہیں ویسی ہی پابندیاں اس کے خواہشاتی اور تمایلاتی بُعد پر بھی عائد ہیں اور حیوان اس لحاظ سے بھی ایک مخصوص جیل میں مقید ہے۔

اگر حیوان کسی ایسے مقصد کی تلاش میں نظر آئے یا وہ کسی ایسی منزل کی طرف رواں دواں دکھائی دے جو ان حدود سے باہر ہو مثلاً اس کا تعلق فرد سے نہ ہو بلکہ نوع سے ہو، حال کے لئے نہ ہو بلکہ مستقبل کے لئے ہو، جیسا کہ شہد کی مکھی یا بعض دوسرے سماجی جانور، تو یہ جان لینا چاہیے کہ اس کی یہ روش کسی علم کے بنیاد پر نہیں، بلکہ یہ عمل لاشعوری طور پر عزیزہ کے حکم اور اس طاقت کے بلا واسطہ فرمان کے ماتحت انجام پا رہا ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور پوری دنیا کے نظام کو چلا رہی ہے۔

انسان کے عرفان و آگہی کی وسعت اور اس کی خواہشات کی سطح

انسان کی قلمرو، چاہے وہ علم و افکار، عرفان و آگہی کی سمت میں ہو اور چاہے خواہشات و مطالبات کی سمت میں، حیوان کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع اور بلند و بالا ہے۔ انسان کا عرفان و آگہی، علم و معرفت، اشیاء اور واقعات کے ظہور سے گزر کر ان کی ماہیت و کنہ ذات، ان کے روابط و تعلقات، نیز ان پر حاکم ضرورتوں کی تہ تک پہنچ جاتا ہے۔ انسان کا علم و معرفت نہ مکان اور علاقہ کی حدود میں محدود ہے اور نہ ہی اس کو زمانہ کی زنجیروں میں جکڑا جا سکتا ہے۔ وہ زمان و مکان کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ماحول کے علاوہ دوسری چیزوں کے بارے میں علم حاصل کر لیتا ہے، یہاں تک کہ دوسرے کروں کا انکشاف کرتا ہے، اور اپنے ماضی و مستقبل سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ اسی سبب سے وہ اپنے اور دنیا کے ماضی کی تاریخ یعنی زمین، آسمان، پہاڑوں، دریاؤں، نباتات اور دوسرے جانداروں کی تاریخ کا بھی انکشاف کر لیتا ہے اور مستقبل کے بارے میں بہت دور کی سوچتا ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ انسان لامحدود اشیاء و امور اور جاودان اور ہمیشہ رہنے والے معاملات کو اپنی فکر کی جولا نگاہ بنا لیتا ہے اور ان لامحدود و جاودان معاملات کی معرفت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ انسان فردیت اور جزئیت کی حدود سے آگے بڑھ کر کلی قوانین اور ایسے عمومی حقائق کا انکشاف کر لیتا ہے جو پوری دنیا کو احاطہ کئے ہوئے ہیں اور یوں وہ طبیعت کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

انسان خواہشات اور مطالبات کے لحاظ سے بھی اونچی سطح کا مالک ہو سکتا ہے۔ انسان ایک ایسا موجود ہے جو اقدار کا جویا، مقاصد کی تلاش میں سرگردان اور کمال مطلوب کی جستجو میں سرگرم عمل رہتا ہے، وہ ایسے مقاصد کی جستجو نہیں کرتا ہے جو مادی اور سرسری فائدوں کے حامل یا صرف اس کی ذات یا زیادہ سے زیادہ اس کے بیوی بچوں کے مفادات سے مخصوص ہوں بلکہ وہ ان مقاصد کے

لئے کوشاں رہتا ہے جو تمام انسانیت کے لئے مفید اور کسی خاص علاقہ، ماحول یا کسی خاص زمانہ میں محدود نہ ہوں۔

انسان اس حد تک با مقصد ہے کہ بعض اوقات اس کے عقیدہ اور مقصد کی قدر قیمت تمام اقدار سے بڑھ جاتی ہے۔ اس کے لئے دوسرے انسانوں کی خدمت اور ان کو آرام و سکون پہنچانا، خود اپنے آرام و سکون سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کے پیر میں کانٹا چبھ جائے تو ایسا معلوم ہوتا کہ خود اس کے پیر میں بلکہ آنکھ میں چبھ گیا ہے، دوسروں کا ہمدرد ہو جاتا ہے، دوسروں کی خوشی سے خوش اور ان کے رنج و غم سے غمگین ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے مقدس مقصد اور عقیدہ سے اس حد تک عشق کرنے لگتا ہے کہ اپنے مفادات بلکہ اپنی زندگی کو بڑی آسانی سے اس عقیدہ پر قربان کر دیتا ہے۔

عالم بشریت کی تہذیب و تمدن کا انسانی پہلو جو اس تمدن کی جان سمجھا جاتا ہے، اسی قسم کے جذبات و احساسات اور خواہشات کی پیداوار ہے۔

انسان کے امتیاز کا معیار

دنیا کے بارے میں انسان کے وسیع افکار، بشریت کی ان مجموعی کوششوں کا نتیجہ ہیں جن کو صدیوں میں جمع کیا گیا ہے اور ارتقاء دیا گیا ہے۔ یہ افکار جب ایک خاص استدلال اور کچھ معین قوائد و ضوابط کے تحت آ گئے تو انہیں "علم" کا نام دیا گیا، علم بمعنی اعم، یعنی دنیا کے بارے میں انسانوں کے تفکرات اس علم میں فلسفہ بھی شامل ہو جائیگا جو انسان کی مجموعی کوششوں کا نتیجہ ہے، اور جسے منطقی انداز سے منظم کر دیا گیا ہے۔ انسان کے معنوی اور بلند مرتبہ تمائلات، اس دنیا کے کچھ ایسے حقائق کے ساتھ اس کا لگاؤ، اعتقاد اور ایمان کی پیداوار ہیں، جو ماورائے فرد بھی ہیں، عام بھی ہیں، سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں اور ماوراء مادہ بھی ہیں یعنی دنیاوی منافع اور فائدے کی اقسام میں سے نہیں ہیں اور اس قسم کے ایمان اور لگاؤ اپنی جگہ پر بعض ایسی جہاں بینیوں اور جہاں شناسیوں

(یعنی کائنات کے متعلق انسان کی سوچ کے انداز اور کائنات کے بارے میں انسان کی پہچان شناخت و معرفت) کی پیداوار ہیں جن کو یا اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے انسانوں کو عطا کیا ہے یا بعض ایسے فلسفیوں کے افکار کا نتیجہ ہے جو انسان میں ایمان اور مقصد کو فروغ دینا چاہتے تھے۔

مختصر یہ کہ جب انسان کے معنوی، بلند مرتبہ اور حیوانیت سے اعلیٰ تمائلات، اعتقادی اور فکری بنیاد پر برقرار ہو جائیں تو اس کو "ایمان" کا نام دیا جاتا ہے۔

اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسرے جانداروں اور حیوانات کے مقابلے میں انسان کا اساسی امتیاز اور فرق اس کے بنیادی صفات ہیں جن کی بناء پر وہ ان سے مختلف نظر آتا ہے اور جو اس کی انسانیت کا معیار ہیں یا جن سے اس کی انسانیت وابستہ ہے، وہ:

"علم" اور "ایمان" ہیں۔

دوسرے جانداروں سے انسان کے امتیاز کے بارے میں بہت زیادہ گفتگو ہوتی رہتی ہے بعض حضرات اس نوع اور تمام انواع کے درمیان بنیادی امتیاز کے منکر ہیں اور وہ انسان اور حیوان میں عرفان و آگہی کی کمی (یعنی مقدار کا) فرق سمجھتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کیفی (یعنی کیفیت کا) فرق سمجھتے ہیں، لیکن ان کی نظر میں یہ فرق ماہوی (یعنی ماہیّت کا فرق) نہیں ہے۔ انسان کی شناخت اور معرفت کے سلسلہ میں اس گروہ نے ان تمام حیرت انگیز باتوں، اہم نکات اور بلند مرتبہ اقدار کی جانب کوئی توجہ نہیں دی ہے جنہوں نے مشرق و مغرب کے بڑے بڑے فلسفیوں کی تمام تر توجہات کو مکمل طور پر جذب کر لیا ہے۔

یہ گروہ انسان کو خواہشات اور مقاصد کے لحاظ سے بھی ایک مکمل حیوان سمجھتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اور حیوان میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں (۱) ہے۔ ایک اور گروہ انسان اور حیوان کے

---

(۱) انسان کے بارے میں انگلستان کے مشہور فلسفی ھامنز کا نظریہ۔

درمیان رُوح اور جان کے فرق کا قائل ہے۔ یعنی اس کا خیال یہ ہے کہ اور مخلوقاتِ عالم میں صرف انسان ہی ذی حیات مخلوق ہے۔ ان کے نزدیک دوسرے حیوانوں میں نہ احساس پایا جاتا ہے اور نہ رغبت، نہ درد نہ لذت بلکہ یہ بے جان مشینیں ہیں جو جانداروں سے شباہت رکھتی ہیں، جاندار موجود صرف انسان ہے، چنانچہ انسان کی حقیقی تعریف یہ ہے کہ ایک ایسا موجود ہے جو جان رکھتا ہے (۱)۔ ان کے علاوہ جو دانشور انسان کو دنیا کا اکیلا جاندار نہیں مانتے نیز انسان اور دوسرے جانداروں کے درمیان بنیادی امتیازات کے قائل ہیں، ان میں بھی کئی گروہ پائے جاتے ہیں، اور ان میں سے ہر گروہ نے انسان کی کسی ایک خاصیّت اور امتیاز کی طرف توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی تعریف کو مختلف تعبیروں اور تعریفوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ''حیوانِ ناطق'' (سوچ کر بولنے والا یا سوچنے والا) ''مطلق طلب'' (ایسا وجود جو مطالبہ اور جستجو کا مجسمّہ ہو)۔ لا متناہی (لامحدود)۔ ارمان خواہ'' (با مقصد کام کرنے والا) '' غیر معین''۔ متعہد و مسئول'' (ذمہ دار) '' مستقبل کی فکر رکھنے والا'' '' آزاد و خود مختار''۔ ''گناہ گار'' ''معاشرت پسند''۔ ''نظم و انضباط پسند''۔ ''حسن پسند'' ''عدالت پسند''۔ ''منافق''۔ ''عاشق''۔ ''مکلّف''۔ صاحب وجدان''۔ ''دو ضمیر رکھنے والا''۔ '' موجد اور خلاق''۔ ''اکیلا''۔ ''مضطرب''۔ ''عقیدہ پرست''۔ ''اوزار ساز''۔ ماوراء کی جستجو کرنے والا''۔ خیال آفریں''۔ ''معنوی'' ''معنویت کا دروازہ'' وغیرہ وغیرہ ہے۔

واضح سی بات ہے کہ ان میں سے ہر امتیاز اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اگر ہم انسان کی ایسی تعریف بیان کرنا چاہیں جس میں اس کے تمام بنیادی امتیازات جمع ہوں تو اس کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ اسے علم وایمان کے حوالے سے یاد کریں اور یہ کہیں کہ انسان ایک ایسا حیوان ہے جو ''علم و ایمان'' کے دو امتیازات کے زریعے دوسرے جانداروں سے ممتاز ہے۔

---

(۱) ڈیکارٹ کا نظریہ

انسانیت اصل ہے یا فرع؟

یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ انسان بھی ایک قسم کا حیوان ہے، اسی وجہ سے وہ بہت سی صفات میں جانوروں میں شریک ہے، لیکن اس کے باوجود کچھ ایسے بنیادی امتیازات ہیں جنہوں نے اس کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کر دیا ہے۔

حیوان کے ساتھ انسان کی مشترک چیزوں، اور حیوان سے اس کو ممتاز کرنے والی چیزیں ہی اس بات کا سبب بنی ہیں کہ انسان دو قسم کی زندگی کا مالک ہو، حیوانی زندگی اور انسانی زندگی، اور بالفاظ دیگر مادی زندگی اور ثقافتی زندگی۔

یہاں پر یہ مسئلہ پیش ہے کہ انسان کی حیوانیت اور اس کی انسانیت، اس کی حیوانی اور انسانی زندگی، نیز اس کی مادی اور ثقافتی و روحانی زندگی کے درمیان کس قسم کا رابطہ ہے؟

کیا ان دونوں میں سے ایک اصل ہے اور دوسری فرع ہے، ایک اساس ہے اور دوسری اس کا انعکاس؟ کیا مادی زندگی اصل ہے اور ثقافتی زندگی فرع؟ اور کیا انسان کی حیوانیت اصل ہے اور اس کی انسانیت فرع ہے؟

چونکہ آج کل اسی سلسلہ میں جو بات زیر بحث ہے وہ نفسیاتی پہلو کے بجائے سماجی اور معاشرتی پہلو سے تعلق رکھتی ہے، علم نفسیات کے بجائے اجتماعیات کے نقطہ نظر سے گفتگو کی جاتی ہے، اس لئے گفتگو کا انداز یہ ہے کہ، کیا سماجی ڈھانچوں میں سے معاشیاتی، ڈھانچہ جو پیداوار اور تولیدی رابطوں سے تعلق رکھتا ہے، اصل اور بنیاد ہے اور بقیہ تمام سماجی ڈھانچے خصوصاً وہ چیزیں جن میں انسان کی انسانیت متجلّی ہے سب کی سب فرع ہیں، اور معاشیاتی ڈھانچے کا انعکاس ہیں؟ کیا علم و فلسفہ وادب و دین وحقوق و اخلاق و ہنر ہر زمانہ میں معاشیاتی واقعیتوں کے مظہر اور نمونہ تھے، اور خود ان کی اپنی کوئی اصالت وحقیقت نہیں ہے؟

جی ہاں، مسئلہ کی پیشکش کا اندازہ یہی ہے، خواہ نخواہ علم اجتماعیات کی اس بحث کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ خود بخود نفسیاتی پہلو کا حامل ہوتا ہے اور پھر بات انسان اور اس کی واقعیت و حقیقت کے بارے میں فلسفیانہ گفتگو تک جا پہنچی ہے، جسے آج کی اصطلاح میں ''اصالتِ انسان'' یا ''ہیومانزم'' کہتے ہیں۔ اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی انسانیت کسی صورت میں بھی اصالت نہیں رکھتی بلکہ انسان میں جو چیز اصالت رکھتی ہے وہ فقط حیوانیت ہی ہے، انسان کی اپنی حیوانیت کے مقابلے میں انسانیت نام کی کسی اصالت کا حامل نہیں ہے۔ یوں اسی گروہ کے نظریہ کی تائید ہو جاتی ہے جو انسان اور حیوان کے درمیان ایک بنیادی امتیاز کا منکر ہے۔

اس نظریہ کے مطابق نہ صرف یہ کہ تمام انسانی تمایلات کی اصالت کا انکار ہو جاتا ہے چاہے وہ حقیقت پسندی سے متعلق ہوں یا خیر پسندی سے یا حسن نوازی سے متعلق ہوں یا خدا نوازی سے بلکہ دنیا اور واقعیت کے بارے میں انسان کے نقطۂ نظر سے واقع پسندی کی اصالت کا بھی انکار ہو جاتا ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ کوئی نظریہ صرف نظریہ ہو، غیر جانبدارانہ ہو، بلکہ ہر نظریہ ایک مخصوص مادی تمائل کو منعکس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

تعجب تو یہ ہے کہ بعض وہ مکاتب فکر جو اس قسم کا نظریہ پیش کرتے ہیں، اسی حالت میں وہ انسانیت و انسانی نوازی کا اور ہیومانزم کا دم بھی بھرتے ہیں!!!

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ارتقائی سفر حیوانیت سے شروع ہوتا ہے اور انسانیت کی جانب آگے بڑھتا ہے، یہ قانون اور اصول، فرد کے بارے میں بھی صادق آتا ہے اور معاشرے کے بارے میں بھی انسان اپنے وجود کی ابتداء ایک مادی جسم ہے اور جوہری ارتقائی حرکت کے ذریعے روح یا روحانی جوہر میں بدل جاتا ہے۔ ''انسان کی رُوح'' اس کے جسم کے دامن میں پیدا ہوتی ہے، پروان چڑھتی، ترقی کے مراحل طے کرتی ہے اور استقلال حاصل کر لیتی ہے۔ انسان کی حیوانیت بھی ایک گھونسلے اور آشیانے کی مانند ہے، جس میں اس کی انسانیت پروان چڑھتی اور ترقی پاتی ہے

اور جیسا کہ ارتقاء و تکامل کی خاصیت ہے (کہ متکامل اور ترقی یافتہ موجود جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی مستقل اور قائم بالذات نیز اپنے ماحول پر اثر انداز اور حاکم ہوتا جاتا ہے) انسان بھی انفرادی یا اجتماعی جس پہلو سے بھی اپنے ارتقاء اور تکامل کے جس قدر مراحل طے کرتا جائے گا وہ اسی قدر استقلال اور تمام پہلوؤں پر اپنی حاکمیت کی جانب بڑھتا جائے گا، ارتقائی مراحل کو طے کئے ہوا انسان ایک ایسا فرد ہے جو اپنے بیرونی اور داخلی ماحول پر نسبی طور پر مسلط ہے، ارتقائی مراحل کو طے کئے ہوئے انسان کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیرونی اور داخلی ماحول کی محکومیت اور قید و بند سے آزاد ہو کر عقیدہ و ایمان سے وابستہ ہو گیا ہے۔ معاشرہ کا ارتقاء بھی بعینہ اسی طرح رونما ہوتا ہے کہ رُوح جسم کی آغوش میں ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہے۔ اور ''فرد'' کی انسانیت اس کی حیوانیت کے دامن میں پروان چڑھتی ہے۔

انسانی معاشرہ کی بنیاد زیادہ تر معاشیاتی ڈھانچوں کے ساتھ پڑتی ہے۔ معاشرہ کے معنوی اور ثقافتی پہلو اس معاشرہ کی روح کی مانند ہیں جس طرح رُوح اور جسم کے درمیان تاثیر متقابل ہے ۔ یعنی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، معاشرہ کی روح اور جسم یعنی اس کے مادی اور معنوی ڈھانچے کے درمیان بھی اسی قسم کا رابطہ برقرار ہے۔ جس طرح سے فرد کا ارتقائی سفر، روح کی زیادہ سے زیادہ حاکمیت اور آزادی و استقلال کی جانب ہوتا ہے، معاشرہ کا ارتقائی سفر بھی ایسا ہی ہے یعنی انسانی معاشرہ جس قدر ارتقائی مراحل طے کرتا جائیگا، اتنا ہی زیادہ ثقافتی زندگی، اس کی مادی زندگی کے مقابلے میں استقلال حاصل کرتی جائے گی اور مادی زندگی پر اس کی حاکمیت بڑھتی جائیگی، مستقبل کا انسان ثقافتی حیوان ہے، نہ کہ معاشیاتی حیوان، مستقبل کا انسان عقیدہ، ایمان اور مسلک کا انسان ہے نہ کہ روٹی کپڑے اور مکان کا انسان۔

البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسانی معاشرہ، جبر اور ضرورت کے ماتحت قدم بقدم صراط مستقیم پر ارتقاء و کمال اور انسانی اقدار کی طرف آگے بڑھ رہا ہے اور ہمیشہ انسانی معاشرہ اس نقطہ نظر سے ہر

زمانہ میں گذشتہ کی نسبت ایک قدم آگے ہے۔ ممکن ہے انسان اپنی معاشرتی زندگی کے کچھ ایسے دور طے کرے جن میں تمام ٹیکنکل اور فنی ترقیوں کے باوجود انسانی معنویات کے لحاظ سے اپنے ماضی کی نسبت بہت زیادہ کمزور ہوجائے، جیسا کہ اس دور کے انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی کوششوں اور تحریکوں میں مجموعی طور پر مادی لحاظ سے اور معنوی لحاظ سے بھی ترقی کی طرف رواں دواں ہے۔ معنوی نقطہ نظر سے انسان کا ارتقائی سفر یکساں اور سیدھا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا سفر ہے اور ایک ایسی تحریک ہے جو کبھی دائیں طرف کو کج ہوجاتی ہے اور کبھی بائیں طرف کو، اس میں کبھی وقفہ پیدا ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی یہ ماضی کی طرف بھی لوٹ جاتی ہے، اس کے باوجود یہ مجموعی طور پر ایک ایسا سفر اور تحریک ہے جو ارتقاء اور کمال کی جانب قدم بڑھا رہی ہے۔ اسی سبب سے ہم کہتے ہیں کہ مستقبل کا انسان، ثقافتی حیوان ہے نہ کہ معاشی حیوان، مستقبل کا انسان عقیدہ وایمان کا انسان ہے۔ نہ کہ روٹی کپڑے اور مکان کا انسان۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کا انسانی پہلو اپنی اصالت کی وجہ سے ، اس کے تولیدی (پیداواری) اوزار کے ارتقاء کے دوش بدوش ترقی کرتا ہے بلکہ اسکی ترقی تولیدی اوزار کی ترقی پر مقدم ہے اور اسی ارتقاء کی بناء پر آہستہ آہستہ طبعی اور سماجی ماحول سے اسکی وابستگی اور اس ماحول سے متاثر ہونے میں کمی ہوتی جائیگی اور اسکی آزادی میں اضافہ ہوتا جائیگا جس کا مطلب ہے کہ وہ عقیدہ وہدف، مسلک ومکتب اور نظریہ سے وابستہ ہوتا جائیگا اور طبعی ومعاشرتی ماحول پر اس کا اثر بڑھتا جائیگا، ماحول اس پر اثر انداز نہ ہوگا بلکہ وہ ماحول پر اثر انداز ہوگا، اور وہ مستقبل میں زیادہ سے زیادہ کامل، روحانی ومعنوی آزادی، یعنی استقلال اور عقیدہ وایمان، مکتب فکر ونظریہ سے وابستگی حاصل کرلے گا، اس کے باوجود کہ انسان ماضی میں طبیعت کی نعمتوں اور اپنے وجود کی نعمتوں سے بہت کم فائدہ اٹھاتا تھا، وہ آج سے کہیں زیادہ اپنے وجود کی حیوانیت اور طبیعت کا غلام تھا لیکن مستقبل کا انسان طبیعت اور اپنے وجود کی نعمتوں سے بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے گا

اور ماضی کے انسان کی بہ نسبت اپنی حیوانی طاقتوں اور طبیعت کی قید وبند سے بھی آزاد ہوگا اور اپنے اور طبیعت پر اپنی حاکمیت کو بھی بڑھالے گا۔

اس نظریہ کے مطابق، انسانی واقعیت، اگرچہ انسانی کی مادی اور حیوانی ترقی کے ہمراہ اور اس کے دامن میں پروان چڑھتی ہے لیکن کسی طرح سے انسان، مادی ارتقاء کا سایہ اور انعکاس یا اس کے تابع نہیں ہے بلکہ وہ خود ایک ترقی یافتہ، مستقل واقعیت ہے جس طرح سے مادی پہلو اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی اس پر اثر انداز ہوتی ہے، انسان کی آخری سرنوشت وتقدیر کو اس کا اصلی ثقافتی ارتقائی سفر اور اس کی اصلی انسانی واقعیت معین کرتی ہے نہ کہ تولیدی (پیداواری) اوزار کا ارتقائی سفر، ایسا ہرگز نہیں ہے کہ تولید کے اوزار خود بخود ترقی یافتہ ہوجاتے ہیں اور انسان کی انسانیت کی تولیدی نظام کی توجیہہ کرنے والے اوزار کی طرح بدلتی رہتی ہیں اور اس کو ترقی وتکامل کا نام اس لئے دیا گیا کہ وہ ترقی یافتہ تولیدی نظام کی تفسیر کرتی ہے، بلکہ یہ انسان کی انسانی واقعیت ہی ہے جو سفر کو جاری رکھتی ہے اور زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ تولیدی اوزار کو بھی ترقی یافتہ بناتی ہے۔

علم اور ایمان

علم وایمان کا رابطہ

یہاں تک کی گفتگو کے نتیجہ میں ہم انسان کی انسانیت اور اس کی حیوانیت کے رابطہ اور دوسرے لفظوں میں انسان کی معنوی وثقافتی زندگی کے ساتھ اس کی مادی زندگی کے رابطہ کو سمجھ چکے ہیں۔ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انسان میں انسانیت، اصالت اور استقلال رکھتی ہے۔ اس کی صرف حیوانی زندگی کا انعکاس نہیں ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہے کہ علم اور ایمان، انسان کی انسانیت کے دو بنیادی رکن ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسانیت کے ان دونوں ارکان اور ان دونوں چہروں کے درمیان کس قسم کا رابطہ ہے یا کس قسم کا رابطہ ہوسکتا ہے۔

افسوس ہے کہ تورات میں کچھ تحریفات کی وجہ سے عیسائی دنیا میں لوگوں کے ذہنوں میں ایک ایسی فکر نے جڑ پکڑلی ہے جو علم اور ایمان دونوں ہی کے لئے اچھی خاصی نقصان دہ ثابت ہوئی، اور وہ فکر یہ ہے کہ علم اور ایمان کے درمیان تضاد ہے، اس فکر کا سرچشمہ وہ باتیں ہیں جو تورات میں کتاب تکوین میں بیان ہوئی ہیں۔

چنانچہ باب دوم، آیت ۱۶، ۱۷ کتاب تکوین میں آدمؑ، بہشت اور ممنوعہ درخت کے بارے میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں:۔

"خداوند عالم نے آدم کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ تم باغ کے تمام درختوں سے بلا روک ٹوک کھا سکتے ہو، لیکن اچھائی اور برائی کی معرفت کے درخت سے ہرگز نہ کھانا، کیونکہ جس دن اس کو کھاؤ گے یقیناً مرجاؤ گے"۔

تیسرے باب آیت ۱۔۸ میں ہے:۔

"اور سانپ صحرا کے ان تمام حیوانوں سے زیادہ ہوشیار اور چالاک تھا جن کو خدا نے پیدا کیا تھا۔ اور

اس نے عورت (حوّا) سے کہا۔ کیا حقیقتاً خدا نے کہا کہ باغ کے تمام درختوں سے نہ کھاؤ۔ عورت نے سانپ سے کہا۔ ہم باغ کے پھلوں کو کھاتے ہیں لیکن وہ درخت جو باغ کے بیچ میں ہے خدا نے اس کے پھل کھانے اور اسے چھونے سے منع کردیا ہے تاکہ کہیں مر نہ جائیں۔ سانپ نے عورت سے کہا۔ ہرگز نہیں مروگی۔ بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن اس پھل کو کھالو گی تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور خدا کی طرف سے اچھائی اور برائی کو پہچان لوگی۔ اور جب عورت نے دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا ہے، خوشنما اور دلپذیر نظر آتا ہے اور علم کو بڑھاتا ہے، پس اس کے پھل کو توڑ کر کھالیا اور اپنے شوہر کو بھی دیا۔ انہوں نے بھی کھالیا۔ اس وقت دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ ننگے ہیں، پس انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے بدن کو اس سے ڈھانپا"۔ اسی باب آیت ۲۳ میں ہے:۔

"اور خداوند نے کہا بتحقیق انسان مجھ جیسا ہوگیا، نیکی اور برائی کو پہچانتا ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ کہیں اپنے ہاتھ بڑھا کر زندگی کے درخت سے بھی توڑ کر کھائے اور ہمیشہ کیلئے زندہ ہوجائے"

انسان، خدا، عرفان اور گناہ کے بارے میں اس قسم کے نظریہ کے مطابق خدا کا حکم یہ ہے کہ انسان اچھائی اور برائی کو نہ پہچان سکے، عالم نہ بنے، ممنوعہ درخت، عرفان وآگہی کا درخت ہے۔ انسان خدا کے حکم کو ٹھکرا کر (شریعتوں اور پیغمبروں کی تعلیمات سے سرتابی کرکے) عرفان وآگاہی حاصل کرتا ہے اور اسی وجہ سے خداوند عالم کی جنت سے نکال دیا جاتا ہے۔

اس نظریہ کی بنیاد پر تمام وسوسے، عرفان وآگاہی کے وسوسے ہیں، پس وسوسے ڈالنے والا شیطان وہی عقل ہے۔ ہم مسلمانوں کے لئے جنہوں نے قرآن سے یہ سیکھا ہے کہ خداوند عالم نے آدمؑ کو تما اسماء (حقائق) سکھادیئے اور اس وقت فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں اور شیطان اس وجہ سے راندہ درگارہ ہوگیا اس نے حقائق سے باخبر، اللہ کے خلیفہ کو سجدہ نہیں کیا اور حدیث وسنت نے ہمیں بتایا کہ شجرہ ممنوعہ، حرص ولالچ جیسی چیز تھی، یعنی وہ چیز جو آدمؑ کی حیوانیت سے تعلق رکھتی تھی نہ

کہ ان کی انسانیت سے، اور وسوسہ کرنے والا شیطان ہمیشہ عقل کے خلاف اور حیوانی ہوئی وہوس و خواہشات نفسانی کے مطابق وسوسہ کراتا ہے۔ اور جو چیز انسان کے وجود میں شیطان کا مظہر ہے وہ نفس امارہ ہے، نہ کہ انسان کی عقل، جی ہاں! ہم لوگوں کے لئے جنہوں نے اس قسم کی چیزیں سیکھی ہیں۔ یہ چیزیں جو کتاب تکوین میں بیان ہوئی ہیں بہت ہی زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں۔

یہی نظریہ ہے جو یورپ کی تہذیب کی تاریخ کو آخر کے ان ڈیڑھ ہزار برسوں میں، عصر ایمان اور عصر علم میں بانٹ کر علم وایمان کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آراء کردیتا ہے۔ حالانکہ اسلامی تہذیب کی تاریخ کو جن دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں۔

ا۔ عصر ترقی کہ ایمان وعلم کی ترقی کا دور ہے۔ اور

۲۔ عصر انحطاط کہ علم اور ایمان دونوں کو ایک ساتھ زوال آیا ہے۔ ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اس غلط نظریہ سے جس نے علم وایمان اور انسانیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے دور رکھیں اور اندھی تقلید کرتے ہوئے علم اور ایمان کے تضاد کو ایک حتمی اور مسلم مسئلہ نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس وقت ہم یہ چاہتے ہیں کے اس مسئلہ میں تحقیقی افکار کے ساتھ داخل ہوں اور عالمانہ نقطہ نظر سے بحث وگفتگو کریں۔ کیا واقعاً انسانیت کے ان دوستونوں میں سے ہر ایک کسی ایک زمانہ سے تعلق رکھتا ہے؟ کیا انسان ہمیشہ آدھا انسان رہنے پر مجبور ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر زمانہ میں صرف آدھی انسانیت ہی کا مالک ہو؟ کیا انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ ان دو بدبختیوں میں سے کسی ایک بدبختی سے دوچار ہے؟ جہل اور نادانی سے پیدا ہونے والی بد بختیاں اور بے ایمانی سے پیدا ہونی والی بدبختیاں۔ یہ بات بعد میں واضح ہوگی کہ ہر ایمان خواہ نخواہ ایک خاص قسم کی فکر نیز دنیا اور وجود وہستی کے بارے میں کسی مخصوص نظریہ کی بنیاد پر قائم ہے اور بلاشک وشبہ دنیا کے بارے میں بہت سے نظریئے اور تفسیریں اگرچہ ایمان اور عقیدہ کی بنیاد بن سکتی ہیں، لیکن چونکہ منطقی اور علمی اصول سے سازگار نہیں ہیں لہذا مجبوراً ان نظریوں کو ٹھکرا دینا

پڑے گا، اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بحث تو اس بات میں ہے کہ کیا دنیا کے بارے میں اس قسم کا نظریہ اور فکر نیز وجود اور ہستی کے سلسلہ میں اس قسم کی تفسیر موجود ہے یا نہیں جس کی پشت پناہی علم وفلسفہ ومنطق کی جانب سے بھی ہوتی ہو۔ اور جو ایک سعادت بخش ایمان کے لئے ایک مستحکم بنیاد بھی بن سکے؟

اگر یہ بات ثابت ہوجائے کہ اس طرح کی فکر اور جہان بینی موجود ہے تو پھر انسان ان بدبختیوں میں سے کسی ایک کو برداشت کرنے پر مجبور نہ ہوگا۔

علم اور ایمان کے رابطہ کے بارے میں دو پہلوؤں سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ایک یہ کہ کیا کوئی ایسا نظریہ اور تفسیر موجود ہے جس سے ایمان اور مقصد کے چشمے پھوٹتے ہوں، اور منطق بھی اس کی تائید کرتی ہو، یا یہ کہ علم وفلسفہ ہمیں جس قدر افکار عطا کرتا ہے سب کے سب ایمانوں، امیدوں، خوش فہمیوں اور وابستگیوں کے مخالف ہیں؟ اور یہ وہی مسئلہ ہے جس کے بارے میں بعد میں ”جہان بینی“ کے عنوان سے گفتگو کی جائے گی۔

دوسرا پہلو، انسان پر ایک طرف سے ایمان اور دوسری طرف سے علم کی تاثیرات سے متعلق ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا علم ایک چیز کی طرف دعوت دیتا ہے اور ایمان اس کی مخالف سمت کی جانب؟ علم ہم کو ایک ڈھنگ سے بنانا چاہتا ہے اور ایمان اس کے برخلاف کسی اور ڈھنگ سے؟ علم ہم کو ایک سمت لے جاتا ہے لیکن ایمان کسی اور طرف؟ یا یہ کہ علم وایمان ایک دوسرے کا تکملہ اور متمم ہیں۔ علم ہمارے آدھے وجود کو سنوارتا اور ایمان اسی کے مطابق ہمارے بقیہ آدھے وجود کو سنوارتا ہے؟ تو آیئے دیکھیں کی علم ہمیں کیا دیتا ہے، اور ایمان کیا عطا کرتا ہے؟

علم ہم کو روشنی اور توانائی عطا کرتا ہے اور ایمان عشق وامید وحرارت، علم اوزار بناتا ہے اور ایمان مقصد، علم سرعت دیتا ہے اور ایمان جہت وسمت معین کرتا ہے، علم توانائی حاصل کرتا ہے، اور ایمان خوب سے خوب تر کا خواہاں ہے، علم نمایاں کرتا ہے کہ کیا ہے، اور ایمان الہام دیتا ہے کہ کیا کرنا

چاہیے، علم بیرونی انقلاب ہے اور ایمان اندرونی انقلاب، علم دنیا کو دنیائے آدمیت بناتا ہے اور ایمان روح کو روحِ آدمیت، علم انسان کے وجود کو افقی شکل میں وسعت دیتا ہے اور ایمان عمودی شکل میں عروج دیتا ہے، علم طبیعت ساز ہے اور ایمان انسان ساز، علم بھی انسان کو طاقت بخشتا ہے اور ایمان بھی لیکن علم منفصل طاقت عطا کرتا ہے اور ایمان متصل طاقت، علم حسن ہے اور ایمان بھی حسن ہے، علم عقل کا حسن ہے اور ایمان روح کا حسن ہے، علم افکار کی خوبصورتی ہے اور ایمان احساسات کی خوبصورتی علم بھی انسان کو امن وامان دیتا ہے اور ایمان بھی، علم بیرونی امنیت دیتا ہے اور ایمان داخلی امنیت، علم انسان کو بیماریوں، زلزلوں، طوفانوں کے ہجوم کے مقابلے میں محفوظ رکھتا ہے اور ایمان اضطرابوں، تنہائیوں، بے پناہیوں کے احساس اور بے مقصدیت کے خیالات کے مقابلہ میں علم دنیا کو انسان کے لیے سازگار بناتا ہے اور ایمان انسان کو انسان سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ انسان کو علم وایمان کی ایک ساتھ ضرورت نے دین دار اور بے دین مفکروں کو گہری سوچ میں ڈال دیا ہے علامہ اقبال کہتے ہیں:

''اس دور کی بشریت تین چیزوں کی محتاج ہے (۱) دنیا کی ایک روحانی تفسیر (۲) فرد کی روحانی آزادی (۳) اور ایسا بنیادی اصول جو عالمی تاثیر رکھتا ہے تاکہ بشری معاشرہ کی ارتقاء کی روحانی بنیادوں پر تفسیر کرے، اس میں شک نہیں کہ نئی مغربی تہذیب نے ان میدانوں میں مثالی اور فکری مشینریاں تاسیس کی ہیں۔ لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ جو حقیقت عقل محض کے ذریعہ حاصل ہوئی ہو اس میں اس زندہ اعتقاد کی حرارت نہیں پائی جاسکتی جو صرف شخصی الہام کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عقل محض نے نوع بشر پر کوئی خاص اثر نہیں چھوڑا ہے۔ حالانکہ دین ہمیشہ افراد کے ارتقاء اور انسانی معاشرہ کی تبدیلی کا سبب رہا ہے۔ یورپ کی ''مثالی پسندی'' کبھی بھی ایک زندہ محرک کی شکل میں اس کی زندگی میں ظاہر نہیں ہوئی اور اس کا نتیجہ وہ سرگرداں خوری ہے جو متصادم ڈیموکریسیوں کے درمیان اپنے کو تلاش کر رہی ہے۔ ان کا کام سرمایہ داروں کے

مفاد کی خاطر غریبوں کا صرف استحصال کرنا ہے۔ یقین مانئے کہ آج کا یورپ انسانی اخلاق کے ارتقاء کی راہ میں سب سے بڑا روڑا ہے۔ دوسری طرف مسلمان، وحی کی بنیاد پر استوار ایسے اعلیٰ مطلق مقاصد اور افکار کے مالک ہیں جو زندگی کی عمیق ترین گہرائیوں سے بیان ہوتے ہیں لہذا اس کے ظاہری ہونے کو باطنی رنگ دے دیتے ہیں۔ ایک مسلمان کے لئے زندگی کی روحانی بنیاد ایک اعتقادی امر ہے اور اس عقیدے کے دفاع کی خاطر بہت آسانی سے اپنی جان کو فدا کر دیتا ہے''۔

تاریخ تمدن کا مشہور مئولف ویل ڈورینٹ، لامذہب ہونے کے باوجود کہتا ہے:۔

''پرانی دنیا کا نئی مشینی دنیا کے ساتھ اختلاف صرف وسائل اور ذرائع کے لحاظ سے ہے نہ کہ مقاصد کے لحاظ سے۔۔۔۔۔۔ اگر ہماری تمام ترقیاں، اہداف و مقاصد کی فلاح وبہود کے بجائے صرف اسلوبوں اور وسیلوں پر ہی کی اصلاح ہو تو آپ کیا کہیں گے؟

وہ یہ بھی کہتا ہے:۔

''دولت وثروت تھکا دیتی ہے۔ عقل وحکمت ٹھنڈی اور ہلکی روشنی ہے لیکن عشق ہے جو ناقابل بیان سخاوت کے ساتھ دلوں کو حرارت بخشتا ہے۔

آج اکثر لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ''سائنس ازم'' (محض علم پسندی) اور خالص علمی تربیت انسان کو سنوارنے سے عاجز ہے، خالص علمی تربیت انسان کو آدھا انسان بناتی ہے، نہ کہ کامل انسان، اس ترتیب کا نتیجہ انسان کا خام مواد ہے، نہ کہ سنوارا ہوا انسان، یہ طاقتور اور قوی انسان بناتی ہے نہ کہ صاحب فضیلت انسان، ایک بعدی انسان بناتی ہے نہ کہ چند بعدی انسان، آج ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ علم محض کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ایک ایمانی دار مانی خلاء انسان کو تہدید کر رہا ہے۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اس خلاء کو فلسفہ کے ذریعہ پر کر دیں۔ بعض لوگوں نے ادب وہنر اور انسانی علوم کا دامن پکڑا اور ہمارے ملک میں بھی اس روحانی وایمانی خلاء کو بھرنے کے لئے کم وبیش

انسان نواز ثقافت مخصوصاً مولوی وسعدی و حافظ کے ادب جیسے عرفانی ادب کی پیشکش کی جا رہی ہے حالانکہ وہ اس بات سے غافل ہیں کہ ان ادبوں نے اپنی روح، کشش اور جاذبیت کو مذہب سے حاصل کیا ہے، ان ادبیات کی انسان نواز روح وہی اسلامی و مذہبی روح ہے ورنہ اس دور کا نیا ادب انسان نوازی کے اتنے سارے دعوے کے باوجود کیا وجہ ہے کہ اس قدر سرد، بے جان اور بے جاذبہ ہے، اس میں کشش کیوں نہیں ہے؟ ہمارے عرفانی ادب کے مفاہیم دنیا اور انسان کے بارے میں طرز فکر کی پیداوار ہیں کہ یہ طریقہ تفکر وہی اسلامی طرز فکر ہے۔ اگر ان ادبی شاہکاروں میں سے اسلامی روح کو نکال دیا جائے تو بے جان و مردہ جسم اور کوڑا و کرکٹ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔ ویل ڈورینٹ بھی انہی لوگوں میں سے ہے جو اس خلاء کا احساس کرتے ہیں اور اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے ادب وفلسفہ وہنر کی پیش کش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتا ہے:

''ہمارے سکولوں اور یونیورسٹیوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ زیادہ تر اسپنسر (۱) کے تربیتی نظریہ کی وجہ سے ہے۔ وہ تربیت کی تعریف میں کہتا ہے کہ تربیت انسان کو اس کے ماحول سے ساز گار کر دینا، یہ تعریف بے جان اور میکانکی ہے، اور اس کا سرچمہ ''میکانکی'' فلسفہ ہے اور خلاقِ روح و ذہین اس سے نفرت کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے کالج نظری اور میکانکی علوم سے بھر گئے ہیں لیکن ادب و تاریخ و فلسفہ کے موضوعات سے کہ خود ان کے بقول یہ بے فائدہ ہیں، خالی ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ تربیت جو صرف علمی ہو اس کا نتیجہ اور ماحصل اوزار کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ یہ عمل انسان کو حُسن سے بیگانہ اور حکمت سے جدا کر دیتا ہے۔ دنیا کے لئے بہتر یہ تھا کہ اسپنسر کوئی کتاب ہی نہ لکھتا۔

تعجب ہے، باوجود اس کے کہ ویل ڈورینٹ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ موجودہ خلاء سب سے

---

(۱) انیسویں صدی کا مشہور فلسفی

پہلے ''مقصد کا خلاء'' ہے، مقصد، غایتوں اور ارمانوں کے میدان میں خلاء ہے۔ ایک ایسا خلاء ہے جو مقصدیت پسندی پر جا کر ختم ہوا ہے اور باوجودیکہ وہ تصدیق کرتا ہے کہ یہ خلاء ایک قسم کے تفکر اور انسانی اہداف و مقاصد پر ایک قسم کے ایمان کا خلاء ہے۔ وہ یہ بھی گمان کرتا ہے کہ ہر قسم کی معنویت کے ذریعے سے چاہے وہ خیالات کی دنیا سے آگے نہ بڑھتی ہو اس مرض کا علاج کیا جا سکتا ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ تاریخ وہنر، حسن وشعر اور موسیقی میں سرگرم ہو جانے کے ذریعہ ایک ایسے خلاء کو بھرا جا سکتا ہو جو انسان کی ارمان خواہ اور اعلیٰ مقاصد کی طلبگار فطرت کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے۔

علم اور ایمان کی جانشینی

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ علم وایمان نہ فقط یہ کہ ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کے تکملہ اور متمم ہیں، اب ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ دونوں ایک دوسرے کے جانشین بن سکتے ہیں؟ ایک دوسرے کی کمی کو پورا کر سکتے ہیں؟

ایمان اور علم کی حیثیت کو سمجھ لینے کے بعد پھر اس قسم کے سوال و جواب کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی یہ واضح سی بات ہے کہ نہ علم ایمان کا جانشین بن سکتا ہے کہ روشنی اور توانائی کے علاوہ امید اور عشق بھی عطا کرے، ہماری خواہشات کی سطح کو ارتقاء دے اور ہم کو اپنے مقاصد واہداف تک پہنچنے اور ان مقاصد تک راستے کو طے کرنے میں ہماری مدد کرنے کے علاوہ ان مقاصد واہداف کو ہم سے چھین لے جو غریزہ اور طبیعت کے مطابق فردیت اور خودخواہی کے محور گھوم رہے ہیں اور اس کے بدلے میں ہمیں ایسے اہداف و مقاصد عطا کرے جو روحانی و معنوی تعلقات اور عشق کے محور پر چکر لگائیں۔

ہمارے ہاتھ میں اوزار کی حیثیت سے ہونے کے علاوہ ہماری ماہیت اور جوہر کو بھی بدل دے۔

اور نہ ایمان علم کا جانشین بن سکتا ہے کہ ہمیں طبیعت سے آشنا کرائے۔ ہمارے لئے اس کے قوانین پر سے پردے ہٹائے، اور ہم کو ہماری اپنی معرفت کرائے۔

تاریخی تجربے ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ علم اور ایمان کی جدائی سے انسان کو ہمیشہ ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، ایمان کو علم کے پرتو میں پہچاننا چاہیے، ایمان علم کی روشنی میں خرافات سے محفوظ رہتا ہے، علم اگر ایمان سے جدا ہو جائے تو ایمان جمود اور اندھے تعصب کا شکار ہو جائیگا، اپنے ہی اردگرد چکر لگاتا رہے گا، اور انسان کو کسی منزل پر نہ پہنچا سکے گا، جہاں پر عرفان و آگہی نہ ہو وہاں نادان مومنوں کا ایمان چالاک منافقوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جائیگا، جس کے نمونے صدرِ اسلام کے خوارج اور اس کے بعد کے زمانوں میں مختلف شکلوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ایمان کے بغیر علم بھی، مست زنگی کے ہاتھ میں چاقو، اور آدھی رات میں چور کے ہاتھ میں چراغ کی مانند ہے جس کے ذریعے قیمتی سے قیمتی چیزوں کو چن چن کر چوری کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا بے ایمان عالم کل کے بے ایمان جاہل سے طبیعت و ماہیت، رفتار کردار کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں رکھتا، دونوں کا ملاّ یکساں ہیں، آج کے چرچلوں، جانسوں، اسٹالنوں اور کل کے فرعونوں، چنگیزوں، اور اتیلاؤں کے درمیان کیا فرق ہے؟

ممکن ہے کوئی صاحب یہ کہیں کہ کیا آپ اس بات کو نہیں مانتے کہ علم روشنی بھی ہے اور توانائی بھی؟ علم کا روشنی اور توانائی ہونا بیرونی دنیا ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہماری داخلی دنیا کو بھی روشن کرتا ہے۔ ہمیں ہماری داخلی دنیا کی بھی سیر کراتا ہے اور نتیجہ میں ہم کو داخلی دنیا کی تبدیلی پر بھی قادر بناتا ہے، پس علم دنیا کو بھی تعمیر کرسکتا ہے اور انسان کو بھی سنوار سکتا ہے، پس علم اپنے کام (تعمیر جہان) کو بھی انجام دیتا ہے اور ایمان کے کام (تعمیر انسان) کو بھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی تمام باتیں صحیح ہیں لیکن بنیادی نکتہ یہ ہے کہ علم کی قدرت اور توانائی،، اوزار کی قدرت اور توانائی کی مانند ہے، یعنی انسان کے حکم اور ارادہ کا تابع ہے، انسان جس میدان

میں جو کام بھی انجام دینا چاہتا ہے، علم کے اوزار کے ذریعہ اس کو بخو احسن انجام دے سکتا ہے، اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے اور ان راستوں کو طے کرنے کے لئے جن کو انسان نے اس مقصد تک پہنچنے کے لئے انتخاب کیا ہے علم انسان کا بہترین مددگار ہے۔

لیکن ہماری بحث اس موضوع پر ہے کہ انسان نے اپنے اوزار کو حرکت میں لانے سے پہلے ہی مقصد کو متعین کرلیا ہے۔ اوزار ہمیشہ مقصدوں کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ خود مقاصد کہاں سے پیدا ہوئے ہیں؟ انسان کے طبعی طور پر حیوان اور اکتسابی طور پر انسان ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی انسانی استعدادوں کو ایمان کے پرتو میں آہستہ آہستہ پروان چڑھنا چاہئے، انسان اپنی طبیعت کی بناء پر اپنے طبعی، حیوانی، فردی، مادی اور خود خواہ مقاصد کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور اوزاروں کو انہی کاموں کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اسی سبب سے انسان ایسی طاقت کا محتاج ہے جو انسان کا اوزار اور مقصد نہ ہو بلکہ وہ انسان کو اوزار کی مانند اپنے بنائے ہوئے راستوں کی طرف لے جائے۔ انسان ایک ایسی طاقت کا محتاج ہے جو انسان کے اندر دھماکہ کرے اور اس کی چھپی ہوئی پوشیدہ استعدادوں اور صلاحیتوں کو فولاد بنائے، اس کو ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو اس کے ضمیر میں انقلاب لاکر اس کو ایک نئی سمت اور نیا راستہ عطا کرسکے، یہ ایسا کام ہے جو علم اور انسان و جہان پر حاکم قوانین کے انکشاف کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس طرح کہ اثرات اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب انسان کی روح میں بعض اقدار، مقدس اور گراں بہا ہو جائیں اور خود انسان میں کچھ بلند مرتبہ تمایلات اچھی طرح جگہ کرلیں۔ اور خود یہ تمایلات بھی اپنی جگہ انسان اور جہان کے بارے میں ایک مخصوص طرز فکر اور ایک مخصوص نظریہ کی پیداوار ہوتے ہیں، پھر یہ مخصوص طرز فکر اور نظریہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے کتب خانوں میں ڈھونڈا جاسکے یا قیاس واستدلال کے ذریعے اس کے مفاہیم کا ادراک ممکن ہو۔ بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں ہم آئندہ صفحات میں گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کریں گے کہ یہ علم کی قلمرو سے

باہر ہیں۔

ماضی اور حال کی تاریخ نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ علم اور ایمان کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے کیا نتائج نکلتے ہیں؟ جس جگہ ایمان تھا مگر علم نہ تھا، لوگوں کی انسان دوستانہ کوششیں ایسے کاموں میں صرف ہوئی ہیں جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، بلکہ بعض اوقات تو اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکلا ہی نہیں۔ اور کبھی کبھی تو یہ کوششیں، جمود وخمود، تعصب اور نقصان دہ کشمکشوں کا سرچشمہ بن گئی ہیں چنانچہ انسان کے ماضی کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

اور جہاں علم تھا لیکن ایمان کی جگہ خالی تھی جیسا کہ دورِ حاضر کے بعض معاشروں میں نمایاں ہے کہ وہاں تمام علمی طاقت خودخواہی، خود پرستی، افراط طلبی، ریاست طلبی، مکاری، دھوکہ بازی نیز لوگوں کا استحصال کرنے اور انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی مذموم کوششوں میں صرف کی جاتی رہی۔

گزشتہ دو تین صدیوں کو علم کی پوجا اور ایمان سے نفرت کا دور کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس دور میں بہت سے دانشور اس بات کے معتقد ہوگے کہ انسان کی ان تمام مشکلوں اور اس کی الجھی ہوئی گتھیوں کو علم کی انگلیوں کے ذریعے سلجھایا جاسکتا ہے لیکن تجربہ نے اس بات کو غلط ثابت کردیا۔ اس دور میں کوئی ایسا مفکر نہیں ملے گا جو اس بات سے انکار کرتا ہو کہ انسان کے لئے ایک قسم کے ایمان کی ضرورت ہے، چاہے وہ ایمان بے دینی ہی کیوں نہ ہو، لیکن بہر حال ایک ایسی چیز ہے جو علم کے ماوراء ہے۔

برٹرنڈ رسل مادی رجحانات کے حامل ہونے کے باوجود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ:

''جس کام کا مقصد صرف آمدنی ہو اس سے کوئی مفید نتیجہ ہاتھ نہ آئیگا۔ مفید نتیجہ حاصل کرنے کے لئے ایک ایسا کام اپنانے کی ضرورت ہے جس میں کسی شخص، کسی مقصد، کسی مرام اور کسی غایت پر ایمان موجود ہو۔''

آج مادہ پرست حضرات یہ بھی دعویٰ کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہم فلسفی اعتبار سے مادہ پرست اور اخلاقی لحاظ سے آئیڈیلسٹ ہیں یعنی نظری لحاظ سے مادی ہیں لیکن عملی اعتبار سے امعانی اور معنوی روحانی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان نظریہ کے اعتبار سے مادی ہو لیکن عملاً معنوی ہو؟ اور یہ ایک اایسا مشکل سوال ہے کہ جس کا جواب خود مادہ پرستوں کو دینا چاہیئے۔

عالمی شہرت رکھنے والا دانشور اور مشہور کتاب ''تاریخ علم'' کا مصنف جارج سارٹن اپنی کتاب ''شش بال'' میں انسان کے تعلقات اور روابط کو انسانی بنانے میں علم کی ناتوانی و عاجزی اور ایمانی طاقت کی طرف انسان کی فوری ضرورت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''علم نے بعض میدانوں میں بہت ہی عظیم اور تعجب خیز ترقیاں کی ہیں لیکن دوسرے میدانوں میں مثلاً قومی یا بین الاقوامی سیاست جن کا تعلق انسان کے باہمی روابط و تعلقات سے ہے آج بھی ہم کو دھوکا دے رہے ہیں''۔

جارج سارٹن اعتراف کرتا ہے کہ انسان جس ایمان کا محتاج ہے وہ دینی اور مذہبی ایمان ہے۔ وہ انسان کے لئے ہنر، دین اور علم کے مثلث کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

''ہنر حسن کو آشکار کرتا ہے، اور یہی چیز زندگی کی خوشیوں کا سبب بنتی ہے۔ دین محبت پیدا کرتا ہے اور زندگی کی موسیقی ہے، علم حق و صداقت و عقل سے سروکار رکھتا ہے اور انسانوں کی ہوشیاری کا سبب بنتا ہے، ہمیں ان تینوں کی ضرورت ہے، ہنر کی بھی، دین کی بھی اور علم کی بھی، علم بطور مطلق زندگی کے لئے ضروری ہے، لیکن تنہا علم کافی نہیں ہے۔

مذہبی ایمان

گزشتہ گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انسان ایمان، ارمان اور عقیدہ کے بغیر نہ تو سالم اور مطمئن زندگی بسر کرسکتا ہے اور نہ ہی بشریت اور بشری تہذیب کے لئے کوئی مفید اور ثمر بخش کام

انجام دے سکتا ہے، وہ انسان جو ہر قسم کے ایمان اور عقیدے سے محروم ہو یا تو ایسا موجود بن جائیگا جو خود خواہی میں اس قدر غرق ہے کہ وہ اپنے شخصی مفادات کے خول سے کبھی بھی باہر نہ نکلے۔ یا ایک ایسا سرگردان اور شک و تردید میں گرفتار وجود بن جائیگا جو زندگی میں اخلاقی اور معاشرتی مسائل میں اپنے فرائض کو جانتا ہی نہیں، انسان ہمیشہ اخلاقی اور معاشرتی مسائل سے دوچار ہوا کرتا ہے اور مجبور ہے کہ اس قسم کے مسائل کے مقابلے میں ایک مخصوص ردعمل کا اظہار کرے، انسان اگر کسی مکتب، عقیدہ اور ایمان سے وابستہ ہو تو اس کے فرائض واضح ہیں، لیکن اگر کسی مذہب اور آئین نے اس کے فرائض کو معین نہ کیا ہو تو وہ ہمیشہ حیران و سرگردان رہے گا، کبھی اس طرف جائیگا اور کبھی اس طرف، ایک نامنظم موجود بن جائیگا۔ جی ہاں اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ایک مکتب فکر اور ایک عقیدہ سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔

اب جس چیز کی طرف توجہ دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی ایمان ہی اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو ایک حقیقی مومن بنادے، خود خواہی اور خود پرستی کو ایمان وعقیدہ اور مسلک کے ذریعہ دبا بھی دے اور انسان میں کچھ اس قسم کا ''تعبد'' اور ''تسلیم'' بھی ایجاد کردے کہ انسان مکتب کی جانب سے پیش کئے جانے والے چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ میں بھی شک و تردید نہ کرے اور اس چیز کو اس حد تک گراں بہا، محبوب اور عزیز بھی بنادے کہ اس کے بغیر انسان کے لئے زندگی بے مزہ ، بے معنی اور بے مقصد ہو جائے بلکہ وہ ایک قسم کے تعصب اور غیرت کے ساتھ اس چیز کی حمایت کرے۔

مذہبی ایمانی رجحانات اس بات کا سبب ہیں کہ انسان فروی وطبعی رجحانات کے برخلاف کوششیں کرے اور بعض اوقات اپنے ایمان کی راہ میں اپنی حیثیت اور اپنی جان کو قربان کردے، اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسان کا عقیدہ تقدس کا پہلو اختیار کرلے اور انسان کے وجود پر بطور مطلق حاکم ہو جائے اور یہ بات آشکار ہے کہ یہ صرف اور صرف مذہبی طاقت ہی ہے جو عقائد کو

تقدس عطا کرسکتی ہے اور ان کے احکام کو انسان پر بھرپور طاقت کے ساتھ نافذ کرسکتی ہے۔

بعض اوقات لوگ مذہبی عقائد کے لئے نہیں بلکہ نفسیاتی الجھنوں، کینہ توزیوں، انتقامی جذبات کے دباؤ اور آخر کار ظلم وستم، دباؤ گھٹن کے احساس کے مقابلہ میں ایک شدید ردعمل کی شکل میں فدا کاری کرتے ہیں اور اپنی جان، مال، ناموس اور تمام حیثیت کو قربان کردیتے ہیں اور اس کی مثالیں دنیا کے گوشہ وکنار میں نظر آتی ہیں۔

لیکن ایک مذہبی اور غیر مذہبی عقیدہ میں فرق یہ ہے کہ جہاں پر مذہبی عقیدہ کی بات آئے اور عقیدہ کو تقدس مل جائے تو وہاں پر انسان اپنی مرضی سے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے اور صاف سی بات ہے کہ جو کام ہنسی خوشی اپنی مرضی اور ایمان کے ماتحت انجام دیا جاسکے اس کے اور اس کام کے درمیان واضح فرق ہے جو نفسیاتی الجھنوں اور داخلی پریشان کن گھٹن سے متاثر ہو کر انجام دیا جائے کہ یہ ایک قسم کا دھوکہ ہے اور وہ انتخاب!

دوسرے یہ کہ اگر انسان کی جہان بینی یعنی کائنات کے متعلق اس کی سوچ کا انداز صرف مادی ہو اور وہ اس بنیاد پر ہو کہ تمام واقعیات، محسوسات میں منحصر ہیں تو ہر قسم کی عقیدہ پرستی اور انسانی ومعاشرتی ارمان طلبی ان محسوس واقعیات کے برخلاف ہے جن کو انسان اس وقت دنیا کے ساتھ اپنے رابطوں اور تعلقات میں محسوس کرتا ہے۔

''حسی جہاں بینی کا نتیجہ خود پرستی ہے، نہ کہ عقیدہ پرستی۔ عقیدہ پرستی، اگر ایک ایسی جہاں بینی کی بنیاد پر ہو جس کا منطقی نتیجہ عقیدہ ہے تو وہ خیال پرستی کی حدود سے آگے نہیں بڑھے گی، یعنی انسان موجود واقعیات سے الگ تھلگ اپنے اندر اور اپنے خیال کے سہارے ایک دنیا کی تعمیر کرکے اسی میں مگن رہنے لگے گا، لیکن اگر عقیدہ پرستی کا سرچشمہ دین ومذہب ہو تو وہ ایک ایسی جہان بینی پر تکیہ کئے ہوگی جس منطقی نتیجہ معاشرتی ارمانوں اور عقیدوں کی پیروی ہے، مذہبی ایمان، انسان اور دنیا کے کلی ارمانوں کے درمیان ایک قسم کی ہم آہنگی اور اتحاد ہے، لیکن غیر مذہبی ارمان اور ایمان دنیا سے ایک

قسم کی لاتعلقی اور اپنے لئے ایک ایسی خیالی دنیا کی تعمیر کرنا ہے جسے بیرونی دنیا سے کسی قسم کی حمایت حاصل نہ ہو"۔

مذہبی ایمان انسان کے لئے طبعی تمایلات کے برخلاف صرف کچھ فرائض ہی متعین نہیں کرتا بلکہ انسان کی نظر میں دنیا کے چہرے کو بدل دیتا ہے، دنیا کی عمارت میں، محسوس عناصر کے علاوہ کچھ اور عناصر سے بھی آشنا کراتا ہے۔ وہ خشک، سرد، میکانکی اور مادی دنیا کو جاندار اور ذی شعور دنیا میں بدل دیتا ہے۔ مذہبی ایمان دنیا اور تخلیق کے بارے میں انسان کے خیالات بدل جاتا ہے ۔بیسویں صدی کے ابتدائی دور کا امریکی ماہر نفسیات اور فلسفی ولیم جیمز کہتا ہے۔

"مذہبی فکر ہمیں جو دنیا عطا کرتی ہے وہ اس دنیا کی تمام چیزوں کی حامل تو ہوتی ہے جو ایک مادی فکر کے انسان کے پاس موجود ہوتی ہے، پھر اس میں بہت سی ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو مادی فکر کے انسان کی دنیا میں ہرگز دستیاب نہیں ہوسکتیں"۔

ان باتوں کے علاوہ مقدس اور قابل پرستش واقعیات اور حقائق کی طرف رجحان ہر انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ انسان کچھ ایسے رجحانات اور غیر مادی قوتوں اور استعدادوں کا خزانہ ہے جو پروان چڑھنے کے لئے آمادہ ہیں۔ انسان میں صرف مادی رجحانات ہی نہیں پائے جاتے ہیں اور اس کے روحانی رجحانات صرف تلقینی اور اکتسابی ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ایسے حقائق ہیں کہ علم بھی انکی تائید کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ولیم جیمز کہتا ہے:۔"خواہ ہماری بہت سی خواہشات اور رجحانات کے متحرک اور علت کا سرچشمہ یہی دنیا ہو لیکن ہماری اکثر و بیشتر آرزوؤں اور رجحانوں کا سرچشمہ وہ دنیا ہے جو ماوراء الطبیعت میں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی اکثر آرزوئیں مادی حساب و کتاب کے برخلاف ہیں۔

چونکہ انسان میں یہ خواہشات موجود ہیں اس لئے ان کی تربیت کی ضرورت ہے۔ اگر ان کی صحیح تربیت نہ کی جائے اور ان سے صحیح فائدہ نہ اٹھایا جائے تو وہ برے اور انحرافی راستوں پر لگ کر

انسان کو اس قدر نقصان پہنچائیں گی جس کا تصور بھی محال ہے جیسا کہ بت پرستی، انسان پرستی، طبیعت پرستی، اور ہزاروں قسم کی دوسری پوجائیں یہ سب اسی انحراف اور غلط تربیت کا نتیجہ ہیں۔

اریک فروم کہتا ہے:۔"کوئی شخص ایسا نہیں جو کسی دین کا محتاج نہ ہو، اور سمت معین کرنے کے لئے کچھ حدود اور اپنی وابستگی و لگاؤ کے لئے کوئی موضوع نہ چاہتا ہو، ممکن ہے کہ وہ خود اپنے ان مجموعی عقائد سے آگاہ نہ ہو جو دین کے عنوان سے ہیں اور لادینی عقائد سے ممتاز ہیں اور ممکن ہے کہ اس کے برعکس وہ سوچتا ہو کہ وہ کسی دین کو نہیں مانتا، چنانچہ وہ اقتدار، دولت اور کامیابی جیسے بظاہر لادینی مقاصد کے ساتھ اپنے لگاؤ کو صرف عملی معاملات یا مصلحت کے مطابق امور سے اپنی دلچسپی پر محمول کرتا ہو لیکن دراصل یہ مسئلہ تو سرے سے ہے ہی نہیں کہ انسان کسی دین کو مانتا ہے یا نہیں، بلکہ بحث یہ ہے کہ انسان کس دین کو تسلیم کرتا ہے۔

اس ماہر نفسیات کا مقصد یہ ہے کہ انسان تقدس اور عبادت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، بالفرض اگر وہ خدائے واحد کو نہ مانے اور اس کی عبادت نہ کرے تو یقیناً کسی اور چیز کو حقیقت برتر کے عنوان سے تسلیم کر کے اس کو اپنے ایمان وعبادت و پوجا کا موضوع بنا لے گا۔

پس چونکہ انسان کے لئے کسی عقیدہ، ارمان اور ایمان کی ضرورت ہے اور ایک طرف سے صرف مذہبی ایمان ہی ایسا ایمان ہے جو انسان کو واقعی طور پر زیر اثر رکھ سکتا ہے اور دوسری طرف سے اپنی فطرت کی پکار سے مجبور ہو کر کسی ایسی چیز کی جستجو میں ہے جس کو تقدس اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے اور اس کی پوجا کرے لہذا نجات کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ ہم اپنے مذہبی ایمان کو مستحکم بنائیں۔

قرآن حکیم سب سے پہلی کتاب ہے جس نے اولاً پوری صراحت کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مذہبی ایمان، نظام تخلیق کے ساتھ ایک طرح کی یگانگت و اتحاد رکھتا ہے۔

"اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

کیا خدا کے دین کے علاوہ کسی دوسری چیز کی جستجو کرتے ہیں، حالانکہ زمین وآسمان کے تمام باشندے اس کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

اور ثانیاً مذہبی ایمان کو انسانوں کی فطرت کا جزء بتاتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا.

حق پسندی کے ساتھ اپنے چہرے کو دین کی طرف پھیردو، وہی خدائی فطرت ہے جس سے اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

ایمان کے آثار اور فائدے

اگرچہ اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے مذہبی ایمان کے اثرات واضح ہو چکے ہیں لیکن زندگی کے اس گرانبہا سرمایہ اور اس معنوی دولت کے مفید اثرات سے اچھی طرح سے آشنا ہونے کے لئے اس بحث کو بطور مستقل اور جدا بیان کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔

روسی مصنف ومفکر ٹالسٹائی کہتا ہے۔

’’ایمان ہی وہ چیز ہے جس کے سہارے عوام زندہ ہیں‘‘

حکیم ناصر وخسرو علوی اپنے فرزند کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:۔

’’ز دنیا روی زی دین کردم ایرک — مراں دین، جہاں چہ بود زندان

مراپوراز دین ملکی است در دل — کہ آں ہرگز نخواہد گشت ویران

(میں دنیا سے دین کیطرف اس لئے پلٹ آیا ہوں کہ۔ دین کے بغیر یہ کائنات میرے لئے کنواں اور جیل ہے میرے فرزند! دین دل میں ایک ایسی دولت اور بادشاہی ہے۔ جس کو کبھی زوال نہ آئے گا۔)

انسانی زندگی میں خوشی ومسرت پیدا کرنے، معاشرتی تعلقات وروابط کو بہتر بنانے اور کائنات کے

نظام کی لازمی پریشانیوں کو دور کرنے کے سلسلے میں مذہبی ایمان کے اثرات بہت زیادہ ہیں آئندہ صفحات میں ہم ان تینوں شعبوں میں مذہبی ایمان کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

(۱) خوشی ومسرّت

انسان زندگی میں خوشی ومسرت پیدا کرنے کے سلسلے میں مذہبی ایمان کا پہلا اثر ’’حسنِ ظن‘‘ ہے۔ دنیا اور تخلیق کائنات کے بارے میں حسنِ ظن، مذہبی ایمان، دنیا کے بارے میں انسان کے نظریہ کو ایک مخصوص روپ دیتا ہے کیونکہ وہ خلقت کو با مقصد بتاتا ہے اور اس مقصد کو خیر، ارتقاء اور سعادت بیان کرتا ہے، لہذا فطری طور پر انسان کو کائنات کے کلی نظام اور اس پر حاکم قوانین کے سلسلہ میں پر امید اور خوش بین بنا دیتا ہے، اس وجودی ملک میں رہنے والا با ایمان شخص کی حالت اس شخص کی مانند ہے جو کسی ایسے ملک میں رہتا ہو جس کے انتظامات اور قوانین کو وہ صحیح اور منصفانہ بھی سمجھتا ہو، اور وہ اس ملک کے اصلی حکمرانوں کی حسن نیت پر ایمان رکھتا ہو، اس لئے وہ فطری طور پر یہاں اپنے اور دوسرے تمام لوگوں کی ترقی وارتقاء کے لئے زمین ہموار سمجھتا ہوگا۔ اس کے عقیدہ کے مطابق صرف ایک چیز ہے جو ممکن ہے پسماندگی کا سبب بن جائے اور وہ خود اس کی اور اس جیسے دوسرے انسانوں کی کاہلی اور ناتجربہ کاری ہے، جو مکلّف اور ذمہ دار ہیں۔

ایک ایسا شخص اپنی نظر میں خود ہی اپنی پسماندگی کا ذمہ دار ہوتا ہے، نہ کہ ملک کی انتظامیہ اور ملک میں جو بھی عیب پایا جاتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے اور اس جیسے لوگوں نے اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا ہے، چنانچہ یہ فکر فطری طور پر اس کو غیرت دلاتی ہے اور حسن ظن اور امیدواری کے سایہ میں اس کو متحرک وفعال بنا دیتی ہے۔

لیکن وجود کی مملکت میں ایک کافر شخص اس شخص کے مانند ہے جو ایک ایسے ملک میں رہتا ہو جہاں

کی انتظامیہ، اداروں اور قوانین کو وہ فاسد اور غیر منصفانہ سمجھتا ہو لیکن وہ اس کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور بھی ہو، ایسے شخص کا دل ہمیشہ کینہ اور نفرت سے بھرا رہتا ہے، وہ کبھی بھی اپنی اصلاح کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ اس کو سوچ تو یہ ہوتی ہے کہ زمین و آسمان نامنظم ہیں پوری دنیا ظلم و جور و بدکاری سے بھری ہوئی ہے، مجھ جیسے ایک چھوٹے سے ذرے کے سدھر جانے سے کیا فائدہ ہوگا۔

ایسا شخص کبھی بھی اس دنیا سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، دنیا اس کے لئے ہمیشہ ایک ہولناک اور مہیب جیل کی مانند ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهُ مَعِيْشَةً ضَنْكًا

جو شخص میری یاد سے غفلت اور روگردانی کرے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی، جی ہاں! یہ ایمان ہی ہے جو ہماری زندگی کو خود ہمارے ہی وجود میں وسعت دیتا ہے اور اس سلسلہ میں نفسیاتی دباؤ اور الجھنوں کو ختم کر دیتا ہے۔

خوشی و مسرت کی ایجاد کے لحاظ سے مذہبی ایمان کا دوسرا اثر ''روشن دلی'' ہے۔ انسان جب مذہبی ایمان کی بنیاد پر دنیا کو حق و حقیقت کے نور سے روشن دیکھتا ہے تو یہ روشن بینی اس کی روح فضا کو بھی پرنور بنا دیتی ہے اور اس چراغ کی مانند ہو جاتی ہے جو وجود کی گہرائیوں میں روشن ہو۔ اس کے برخلاف جو شخص ایمان کی دولت سے محروم ہو اس کی نظر میں دنیا بے مقصد، تاریک نیز فکر و ادراک و روشنی سے خالی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس تاریک خانہ میں جس کو خود اس نے فرض کیا ہے اس کے دل کا کاشانہ بھی اندھیرا اور تاریک رہتا ہے۔

خوشی و مسرت کی ایجاد کے لحاظ سے مذہبی ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ انسان کو یہ امید دلاتا ہے کہ اچھی محنت اور کوشش کا نتیجہ اچھا ہوا کرتا ہے۔

مادی منطق کے نقطہ نظر سے دنیا کو ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جو حق یا باطل، عدل یا ظلم، اچھائی یا برائی کے لئے کوشش کرتے ہیں، ان کی نظر میں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے

کیونکہ محنت کا نتیجہ صرف ''محنت اور کوشش کی مقدار'' سے وابستہ ہے۔ اور بس۔

لیکن ایک مومن شخص کے نزدیک دنیا ان دو گروہوں کی محنتوں اور کوششوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتی، ان دو قسم کی محنتوں اور کوششوں کے مقابلہ میں دنیا کا ردعمل یکساں نہیں ہے بلکہ نظام خلقت ان لوگوں کی حمایت کرتا ہے جو حق و حقیقت، اچھائی اور عدالت و خیر خواہی کے لئے کوشش کرتے ہیں، اِنْ تَنْصُرُ اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ. اگر تم خدا کی مدد کرو گے (حق کی راہ میں قدم بڑھاؤ گے) تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ نیک کام کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہ ہوگا۔

خوشی و مسرت کے نقطہ نظر سے مذہبی ایمان کا چوتھا اثر، سکونِ قلب ہے انسان فطری طور پر اپنی سعادت اور خوش نصیبی کی تلاش میں ہے، سعادت اور خوش نصیبی کو حاصل کر لینے کے تصور سے ہی خوشی و مسرت میں غرق ہو جاتا ہے۔ اور بدنصیبی کے بھیانک مستقبل کو سوچ کر ہی اس کا بدن لرزنے لگتا ہے اور سخت تشویش و اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نیز دو چیزیں انسان کی سعادت اور خوش نصیبی کا سبب بنتی ہیں۔

۱۔ کوشش ۲۔ ماحول کے حالات سے اطمینان

ایک طالب علم کی کامیابی دو چیزوں کا نتیجہ ہے۔ ایک خود اس کی محنت اور کوشش دوسرے سکول کے ماحول کی آبادگی اور سازگاری اور پڑھائی کے سلسلہ میں سکول کے منتظمین کی تشویش، ایک محنتی طالب علم اگر اس ماحول میں جس میں وہ پڑھ رہا ہے اور اس ماسٹر پر جو اس کو سالانہ امتحان میں نمبر دیتا ہے، اعتماد نہ رکھتا ہو، اور ان کے سلوک کو ایک غیر منصفانہ سلوک سمجھتا ہو تو وہ ہمیشہ مضطرب اور پریشان ہی رہے گا اور کچھ نہ سیکھ سکے گا۔

اپنے سلسلہ میں انسان جو کچھ انجام دیتا ہے وہ اسے معلوم ہوتا ہے اسلئے اس سلسلہ میں اس کو کسی قسم کی تشویش لاحق نہیں ہوتی، کیونکہ اضطراب اور تشویش، شک و تردید کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

جس چیز کا تعلق خود اپنی ذات سے ہے انسان اس کے بارے میں شک و تردید نہیں کرتا، یہ دنیا ہے جو انسان کو اضطراب اور تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے کیونکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس سلسلے میں اس کا فریضہ کیا ہے۔ کیا اچھا کام مفید ہے؟ کیا صداقت و امانت فضول چیز ہے؟ کیا تمام کوششوں محنتوں اور فرائض کی انجام دہی کا نتیجہ محرومیت ہے؟ ان سوالوں کے جواب کا وقت ہی وہ وقت ہوتا ہے جب اضطراب اور تشویش انتہائی بھیانک روپ میں سامنے آتی ہے۔

چونکہ مذہبی ایمان انسان جو کہ اس معاملہ کا ایک فرد ہے، دنیا کے بارے میں جو کہ اس معاملہ کا دوسرا فرد ہے، اعتماد اور اطمینان دلاتا ہے۔ لہذا انسان کے سلسلے میں دنیا کے سلوک کے بارے میں اضطراب و تشویش کو ختم کر کے اس کو سکون قلب عطا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ مذہبی ایمان کا ایک اثر سکونِ قلب بھی ہے۔

خوشی و مسرت پیدا ہونے کے نقطہ نظر سے مذہبی ایمان کا ایک دوسرا اثر یہ ہے کہ وہ انسان کو کچھ ایسی لذتوں سے بہرمند کرتا ہے جس کو روحانی لذتوں کا نام دیا جاتا ہے، کیونکہ انسان دو طرح کی لذتوں سے بہرمندہ ہوتا ہے، لذتوں کی ایک قسم وہ ہے جو انسان کی کسی ایک حس سے تعلق رکھتی ہے کہ یہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کسی بیرونی مادے سے کسی عضو کا رابطہ برقرار ہو جائے جیسے وہ لذت جو آنکھ کو دیکھنے، کان کو سننے، زبان کو چکھنے اور ہاتھ کو چھونے کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اور لذتوں کی دوسری قسم وہ لذتیں ہیں جو انسان کی روح اور ضمیر کی گہرائیوں سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ کسی خاص عضو سے متعلق نہیں ہیں اور نہ ہی کسی بیرونی مادے سے رابطہ برقرار ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہیں، جیسے وہ لذت جو انسان کو احسان و خدمت یا محبوبیت و احترام، اپنی کامیابی یا اپنی اولاد کی کامیابی سے حاصل ہوتی ہے کہ نہ تو اس کا کسی خاص عضو سے تعلق ہے اور نہ کسی بیرونی مادی چیز کے براہ راست ماتحت ہیں۔

روحانی لذتیں، مادی لذتوں سے زیادہ طاقتور بھی ہیں اور زیادہ دیرپا بھی، حق پرست عارفوں کو خدا

وند عالم کی عبادت سے اسی قسم کی لذت ملتی ہے، وہ عارف و عبادت گزار جو حضور قلب، خلوصِ نیت، خضوع، و خشوع اور استغراق کے عالم میں عبادت کرتے ہیں وہ سب سے زیادہ عبادت ہی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، دین کی زبان میں اس کو "لذتِ ایمان" اور "حلاوت ایمان" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ایمان میں ایک ایسی مٹھاس اور حلاوت پائی جاتی ہے جو تمام حلاوتوں سے بہتر ہے، معنوی لذتیں اس وقت دوگنی ہو جاتی ہیں جبکہ کسبِ علم، احسان، خدمت اور کامیابی جیسے امور کا سرچشمہ دینی احساسات ہوں اور انہیں اللہ کے لئے انجام دیا جائے اور یہ عبادت کی قلمرو میں داخل ہو جائیں۔

(ب) معاشرتی رابطوں کو بہتر بنانے میں ایمان کا کردار

انسان بعض دوسرے جانداروں کی طرح معاشرت پسند پیدا کیا گیا ہے، فرد اکیلے ہی اپنی ضروریات پوری کرنے کی توانائی نہیں رکھتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ زندگی ایک کمپنی کا روپ اختیار کر لے، ہر شخص فرائض اور فائدے میں شریک ہو اور لوگوں کے درمیان ایک طرح کی "تقسیم کار" ہو جائے، لیکن انسان اور شہد کی مکھی جیسے دوسرے سماجی جانداروں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ان جانداروں میں کام اور فرائض کی تقسیم، عزیزہ اور طبیعت کے احکام کے ماتحت ہے اور ہر قسم کی سرپیچی و مخالفت کا حق ان سے چھین لیا گیا ہے لیکن اس کے برخلاف انسان ایک آزاد اور خود مختار موجود ہے۔ اس کو اپنے کام کو آزادی کے ساتھ اور "وظیفہ" و "فریضہ" سمجھ کر انجام دینا چاہیے اور بالفاظ دیگر دوسرے جانداروں کی ضروریات سماجی ہیں اور معاشرتی عزائز بھی جبری طریقے سے ان پر حاکم ہیں لیکن انسان کی ضروریات بھی اگرچہ سماجی ہیں مگر اس پر اس قسم ک عزائز کی حکمرانی نہیں، انسان کے معاشرتی عزائز کچھ "خواہشات" اور "مانگ" کی شکل میں انسان کے باطن میں موجود ہیں جن کو تعلیم و تربیت کے سایہ میں پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔

صحیح وسالم معاشرتی زندگی یہ ہے کہ افراد ایک دوسرے کے حقوق اور قوانین کا احترام کریں۔عدل کو ایک مقدس چیز سمجھیں، ایک دوسرے کے ساتھ محبت کریں، ہر شخص دوسرے کے لئے اسی چیز کو پسند کرے جو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جو چیز اپنے لئے بری سمجھتا ہے اس کو دوسروں کے لئے بھی برا سمجھے۔لوگ آپس میں ایک دوسرے پر اعتماد اور اطمینان رکھتے ہوں۔ان کی روحانی اور نفسیاتی کیفیات ان کے متقابل اعتماد کی ضامن ہوں، ہر شخص خود کو اپنے معاشرہ کا ذمہ دار فرد سمجھتا ہو، مخفی سے مخفی جگہ پر ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کا وہی عالم ہو جیسا کہ بھرے مجمع میں ہوتا ہے۔ کسی لالچ کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کریں، ظلم وستم کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوں، ظالم وستمگر اور فاسد عناصر کو ظلم وستم اور فساد کرنے کی مہلت نہ دیں، اخلاقی اقدار کا احترام کریں۔آپس میں ایک ہی جسم کے اعضاء کی طرح سے متحد اور متفق ہوں۔

تقویٰ اور پرہیزگاری ہی وہ قوت ہے جو حق کو محترم، عدالت کو مقدس، دلوں کو آپس میں مہربان اور لوگوں کے درمیان متقابل اعتماد برقرار کرنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جو چیز ان باتوں کو انسان کے ضمیر کی گہرائیوں میں راسخ کر دیتی ہے، اس کے نزدیک اخلاقی اقدار کو معتبر بناتی، اس میں ظلم وستم سے ٹکر لینے کے لئے شجاعت پیدا کرتی اور تمام انسانوں کو آپس میں ایک جسم کے اعضاء کی طرح متحد کرتی ہے، وہ مذہبی ایمان ہے۔

انسانوں کو وہ انسانی تجلیاں جو حادثات سے بھری ہوئی انسانی تاریخ کے آسمان پر ستاروں کی مانند چمک رہی ہیں۔اور یہ تجلیاں وہ ہیں جن کا سرچشمہ مذہبی احساسات ہیں۔

(ج) پریشانیوں میں کمی

انسان کی زندگی میں جس طرح سے خوشیوں، کامیابیوں اور مقاصد کے حاصل ہو جانے کا وجود ہے، اسی طرح سے رنج والم، مصیبتیں، شکستیں، ناکامیابیاں، تلخیاں اور فرصت کا ہاتھ سے نکل جانا

بھی ہے، ان میں بہت سی چیزوں کی روک تھام بھی ممکن ہے اور ان کو برطرف بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ اس کے لئے بہت زیادہ محنت وکوشش کی ضرورت ہو، یہ واضح سی بات ہے کہ انسان کا فریضہ ہے کہ وہ طبیعت کا مقابلہ کرے، تلخیوں کو حلاوتوں سے بدل دے، لیکن کائنات کے بعض حوادث ایسے ہیں جن کی روک تھام کرنا یا ان کو برطرف کرنا ممکن نہیں جیسے بڑھاپا، انسان خواہ مخواہ بڑھاپے کی جانب بڑھتا جاتا ہے اور اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے قریب آجاتا ہے۔ بڑھاپے کی کمزوری وناتوانی اور اس کے تمام عارضے زندگی کو افسردہ بنا دیتے ہیں اور اس کی موت وفناء، اس کی کائنات سے آنکھ بند ہو جانے، اس دنیا سے چلے جانے اور اس کو دوسرے کے حوالے کر دینے کی فکر انسان کو دکھ پہنچاتی ہے۔

مذہبی ایمان انسان میں مقابلہ اور مقاومت کی طاقت پیدا کرتا ہے، تلخیوں کو حلاوت سے بدل دیتا ہے۔ مومن انسان یہ جانتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کے لئے ایک حساب معین ہے اور اگر تلخیوں کے مقابلے میں اس کا ردِّعمل صحیح ہو تو اگر بالفرض یہ خود تلافی کے قابل نہ ہوں تو خداوند عالم کسی اور طریقہ سے اس نقصان کو پورا کر دے گا، چونکہ بڑھاپا فنا نہیں ہے اور کے علاوہ مومن شخص ہمیشہ اپنے فراغت کے اوقات کو عبادت اور خدا کے ذکر سے انس کے ذریعے گزا لیتا ہے لہذا وہ بڑھاپا اس حد تک دلپسند اور محبوب ہو جاتا ہے کہ خدا پرستوں کے لئے بڑھاپے کے زمانہ میں زندگی کی لذت جوانی سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایک مومن کی نظر میں موت کا چہرہ اس چہرہ سے مختلف ہوتا ہے جو کافر کو نظر آتا ہے۔ مومن کی نظر میں موت فنا ونابودی نہیں، بلکہ فانی دنیا سے باقی اور جاوید دنیا کی جانب سفر ہے۔ چھوٹی دنیا سے بڑی دنیا کی جانب کوچ ہے۔ موت، عمل اور کھیتی کی دنیا سے نتیجے اور جزا کی دنیا میں منتقل ہونا ہے۔ لہذا مومن افراد نیک کاموں میں جس کو دین کی زبان میں "عمل صالح" کہا جاتا ہے کوشش ومحنت کرکے موت کے سلسلہ میں اپنے خوف اور اضطراب کو برطرف کر لیتے ہیں۔

سماجیات کے ماہرین کی نظر میں یہ بات مسلم ہے اور یقینی ہے کہ وہ نفسیاتی بیماریاں جو روح کی پریشانیوں والجھنوں اور زندگی کی تلخیوں کی پیداوار ہیں زیادہ تر غیر مذہبی لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ مذہبی افراد کا ایمان جتنا قوی اور مستحکم ہوتا ہے وہ ان بیماریوں سے اسی قدر محفوظ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی زندگی میں ایمان کے کمزور ہونے کی وجہ سے جو عارضے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہی اعصابی ونفسیاتی بیماریوں اور بیماروں کی تعداد میں اضافہ ہے۔

مکتب، آئیڈیالوجی، نظریہ

مکتب یا آئیڈیالوجی کیا چیز ہے، اور اس کی تعریف کیا ہے؟ کیا ضرورت ہے کہ انسان ایک فرد یا معاشرہ کے ایک عضو کی حیثیت سے ایک مکتب کا پیرو ہو اور ایک آئیڈیالوجی سے وابستہ ہو جائے اور اس پر ایمان رکھتا ہو؟ کیا فرد یا معاشرہ کے لئے ایک آئیڈیالوجی کا ہونا ضروری ہے؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب انسانی زندگی میں اہمیت کا حامل ہے لیکن ان کے جواب سے پہلے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے۔

انسان کی کوششیں دو طرح کی ہوتی ہیں: (۱) التذاذی (۲) تدبیری

التذاذی کوششیں وہی سادہ اور معمولی کوششیں ہیں جن کو انسان کسی قسم کی لذت حاصل کرنے یا کسی رنج وغم سے چھٹکارا پانے کے لئے عزیزہ وطبیعت یا عادت سے جو طبیعت ثانوی کہلاتی ہے براہ راست متاثر ہو کر انجام دیتا ہے مثلاً جب اس کو پیاس لگتی ہے تو وہ پانی سے بھرے ہوئے برتن کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہے، کسی ڈسنے والے جانور کو دیکھتا ہے تو وہاں سے بھاگ جاتا ہے، سگریٹ کی بہت شدت کیساتھ طلب محسوس ہوتی ہے تو سگریٹ سلگا لیتا ہے۔

اس طرح کے کام خواہشات کے مطابق ہیں اور براہ راست لذت ورنج سے سروکار رکھتے ہیں،

لذت بخش کام ایک قسم کی کشش اور جاذبہ کے ذریعہ انسان کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے، اور تکلیف دہ کام ایک قسم کے دافعہ کے ذریعہ انسان کو اپنے سے دور کر دیتا ہے۔

تدبیری کوششیں اور فعالیتیں وہ کام ہیں جن میں بذاتِ خود کسی قسم کا جاذبہ یا دافعہ نہیں پایا جاتا، عزیزہ وطبیعت انسان کو نہ ان کاموں کی طرف رغبت دلاتی ہے اور نہ ہی ان سے دور کرتی ہے بلکہ انسان عقل اور ارادہ کے حکم سے اس مصلحت کی خاطر جو اس کام کو انجام دینے میں پائی جاتی ہے اور اس مصلحت کی خاطر جو اس کو ترک کر دینے میں پوشیدہ ہے، ان کاموں کو انجام دیتا ہے یا ان سے اجتناب کرتا ہے یعنی علتِ غائی اور انسان کو متحرک کرنے والی طاقت، مصلحت ہے نہ کہ لذت، لذت کی طبیعت تشخیص دیتی ہے اور مصلحت کو عقل، لذت خواہشات کو ابھارتی ہے اور مصلحت عقل کو متحرک کرتی ہے، انسان کو التذاذی کاموں سے لذت ملتی ہے، لیکن مصلحتی کاموں سے لذت نہیں ملتی، مگر وہ اس تصور سے کہ اس طرح وہ اپنی آخری مصلحت سے (کہ وہ خیر وکمال یا مستقبل میں کوئی لذت ہے) ایک قدم نزدیک ہو گیا ہے، خوش ہو جاتا ہے، جن کاموں سے انسان کو لذت اور مسرت ملتی ہے اور جن کاموں سے اسے کوئی لذت نہیں ملتی ان میں فرق ہے بلکہ بعض اوقات دوسری نوعیت کے کام تکلیف دہ ہوتے ہیں، لیکن انسان اپنی مرضی سے ہنسی خوشی اس تکلیف کو برداشت کر لیتا ہے، چونکہ مصلحتی کاموں کے نتائج بہت دیر میں حاصل ہوتے ہیں لہذا ان سے لذت ومسرت حاصل نہیں ہوتی لیکن انسان ان کاموں سے راضی رہتا ہے، لذت و رنج میں انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں لیکن رضا اور پسندیدگی یا ناراضگی وناپسندیدگی صرف انسان کی خصوصیات میں سے ہیں جس طرح سے آرزو اور تمنا انسان کی خصوصیات میں سے ہے۔

آرزو، رضا اور ناراضگی انسان کے تفکرات کے دائرہ اور معقولات کے قلمرو میں ہے نہ کہ حواس اور حس اور امات کی حدود میں۔

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ التذاذی کاموں کے برخلاف جو کہ احساس اور خواہشات کے زیر اثر

انجام دیئے جاتے ہیں۔ انسان اپنے تدبیری کاموں کو عقل وارادہ کے سہارے انجام دیتا ہے، کسی کام کے عقل کے حکم کے ماتحت انجام پانے کا مقصد یہ ہے کہ عقل کی محاسب طاقت کسی دور دراز لذت، خیر اور کمال کو دیکھتی ہے اور اس مقصد تک پہنچنے کے راستوں کا انکشاف کرتی ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے منصوبہ بناتی ہے حالانکہ ممکن ہے کہ ان راستوں کا طے کرنا اچھا خاصا کٹھن کام ہو، اور ارادہ کی طاقت کے ذریعے انجام پانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں ایک ایسی طاقت پائی جاتی ہے جو عقل کی طاقت سے وابستہ ہے، اور اس سے عقل کی منظور کی ہوئی تجاویز پر عمل کر واتی ہے، اور بعض اوقات تمام طبیعی کششوں، جاذبوں اور خواہشوں کے خلاف عقلی اور فکری منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔

ایک طالب علم کی جوانی کی طبیعت اس کو کھانے، پینے، سونے، کھیل کود اور عیش و عشرت کی طرف دعوت دیتی ہے، لیکن اس کی محاسب عقل جو ایک طرف سے ان کاموں کے خطرناک نتائج اور دوسری طرف سے محنت و کوشش، جدوجہد اور لذت و شہوت سے چشم پوشی کرنے کے تابناک انجام کو سوچتی ہے، مصلحت کے تقاضوں کی بنا پر اس کو حکم دیتی ہے کہ وہ دوسری شق کا انتخاب کر لے، اس مقام پر انسان عقل کے حکم یعنی مصلحت کو طبیعت کے حکم یعنی لذت پر ترجیح دیتا ہے، اسی طرح سے ایک بیمار دوا سے نفرت کرتا ہے، کڑوی اور بدمزہ دو پینا اس کے لئے مشکل ہے، لیکن مصلحت اندیش عقل کے حکم سے اور خواہشات پر حاکم ارادہ کی طاقت کے ذریعہ وہ کڑوی اور بدمزہ دوا کو پی جاتا ہے۔

اس لئے جس انسان کی فکر و ہمت یعنی عقل وارادہ جتنا زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے وہ اتنی ہی آسانی سے اور مضبوطی سے اپنے تمایلات کے برخلاف اپنے ہدف کی جانب بڑھتا اور احکام کی اطاعت کرتا ہے۔

انسان اپنی تدبیری کوششوں میں ہمیشہ ایک مضبوط ایک اصول اور ایک نظریہ پر عمل کرتا ہے، انسان

عقل وارادہ کے میدان میں جتنا زیادہ ترقی یافتہ ہوگا۔ اس کی کوششیں اتنی ہی زیادہ تدبیری ہونگی، اور وہ جتنا زیادہ حیوانیت سے نزدیک ہوگا اس کی کوششیں اتنی ہی زیادہ التذاذی ہونگی کیونکہ حیوان کی تمام کوششیں التذاذی ہیں، حیوانوں میں بعض اوقات ایسی کوششیں اور فعالتیں نظر آتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دور دراز کے نتائج اور مقاصد کے لئے ہیں، جیسے گھونسلا بنانا، ہجرت، جنسی ملاپ اور تولید نسل، لیکن ان میں سے کوئی کام بھی سمجھ بوجھ کر، مقصد سے واقف ہو کر، مقصد تک پہنچانے والے راستوں کو تلاش کرنے کے لئے سوچ بچار اور وسیلہ کو انتخاب کر کے انجام نہیں پاتا بلکہ ان سے یہ تمام کام ایک غیبی طاقت کی طرف سے ایک قسم کے جبری اور عزیزی الہام کے زیر اثر انجام پاتے ہیں، تدبیری کوششوں کے نقطہ نظر سے انسان کی کوششوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ وہ التذاذی کوششوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے یعنی ممکن ہے۔ مصلحتی منصوبے اتنی زیادہ توجہ کے ساتھ بنائے جائیں کہ لذتیں مصلحتوں کے دائرہ میں آجائیں اور ہر لذت، لذت ہوتے ہوئے مصلحت بھی ہو اور ہر طبعی کوشش و فعالیت، طبیعت کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے عقل کے حکم کی بھی اطاعت کرتی ہو۔ اگر تدبیری فعالتیں التذاذی کوششوں کو اپنے اندر سمولیں اور اگر التذاذی کوششیں زندگی کے عمومی اور کلی تدبیری منصوبوں کا ایک جزء بن جائیں تو طبیعت عقل کے ساتھ اور خواہشات ارادہ کے ساتھ متحد ہو جائیں گی۔

تدبیری کوششیں چونکہ بڑے اور دور رس اغراض و مقاصد کے محور پر گھومتی ہیں اس لئے انہیں ان مقاصد تک رسائی کے حصول کی خاطر لازمی طور پر کسی نہ کسی منصوبہ بندی، اسلوب اور روش کو اپنا نے کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں تک انفرادی معاملات کا تعلق ہے تو جب ایک فرد خود اپنے لئے تدبیر کرتا ہے تو نقشہ کھینچنے، منصوبہ بنانے، نظریہ کے تعین، راہ و روش اور ذرائع کو معین کرنے کا کام انفرادی عقل ہی انجام دیتی ہے اور یہ سب باتیں اس کی ذاتی تعلیمات اور عرفان و آگہی کی سطح، اور قضاوت کی طاقت سے وابستگی رکھتی ہیں۔

اگر بفرضِ محال تدبیری کوششیں اپنی بلندی کے آخری مرحلہ پر پہنچ جائیں تب بھی انسان کی کوششوں کے انسانی ہونے کے لئے کافی نہیں ہیں، انسان کی تدبیری کوششیں، انسانیت کے لئے لازمی شرط ہیں کیونکہ انسان کی آدھی انسانیت کو اسکی عقل وعرفان وآگہی اور تدبیری تشکیل دیتی ہے۔ لیکن یہ شرط کافی نہیں ہے، انسانی کوشش اس وقت انسانی ہوتی ہے جب وہ ارادی اور عاقلانہ ہونے کے علاوہ انسانیت کے بلند مرتبہ رجحانات کے ڈھرے پر بھی ہو یا کم از کم ان بلند رجحانات کے ساتھ ضدیت نہ رکھتی ہو، ورنہ انسان کی سب سے زیادہ خطرناک مجرمانہ کوشش اکثر و بیشتر تدبیروں، ہوشیاریوں منصوبوں اور مصلحت اندیشیوں کے ہمراہ ہوتی ہیں۔ سامراجیوں کے شیطانی منصوبے ہمارے اس دعویٰ کے بہترین گواہ ہیں، جب تدبیری طاقت انسانی اور ایمانی رجحانات سے جدا ہو جائے اور مادی حیوانی مقاصد کے لئے استعمال کی جانے لگے تو اسلامی اور دینی اصطلاحوں میں اس کو "ٹکراؤ" اور "شیطنت" کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ تدبیری کوشش انسانی بھی ہو، بلکہ اگر یہی کوشش حیوانی مقاصد کے محور کے گرد انجام پائے تو یہ حیوانی التذاذ کی کوششوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حیوان اپنے پیٹ کو بھرنے کے لئے کسی حیوان یا انسان کو پھاڑ کھاتا ہے۔ لیکن مدبر اور محاسب انسان اپنی زندگی کی تسکین کے لئے شہروں کو ویران کر دیتا ہے اور لاکھوں بے گناہ انسانوں کو چشم زدن میں بھون ڈالتا ہے۔

آیئے ہم اس مسئلے کو نظر انداز کئے دیتے ہیں ایسی صورت میں آپ اتنے سے سوال کا جواب دے دیجئے کہ کیا عقلی مقاصد انسان کی تمام انفرادی مصلحتوں کے نقطہ نظر سے کافی ہیں؟

بالفاظ دیگر انفرادی مصلحتوں کی نشاندہی کے لحاظ سے انفرادی عقل کس حد تک کام کر سکتی ہے؟

اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عقل وفکر کی طاقت زندگی کے محور اور جزئی تدبیروں کے لئے ضروری اور مفید ہے۔ انسان اپنی زندگی میں ہمیشہ کچھ مسائل سے دوچار رہتا ہے، جیسے دولت کا انتخاب، تعلیمی موضوع کا انتخاب، شریک زندگی کا انتخاب، پیشہ کا انتخاب، سفر، معاشرت تفریح،

نیک اعمال، برائیوں کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد وغیرہ۔ بے شک ان تمام چیزوں میں انسان فکر، سوچ بچار اور تدبیر کا محتاج ہے اور وہ ان معاملات میں جتنی زیادہ سوچ بچار سے کام لیتا ہے اتنا ہی زیادہ کامیاب رہتا ہے اور بعض اوقات اس کو ان مسائل میں دوسروں کے تجربہ اور فکر سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

(اصولِ مشاورت)۔ ان تمام جزئی موارد میں انسان منصوبہ بناتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے۔

لیکن کلی اور وسیع دائرہ کی نوعیت کیا ہے؟ کیا انسان میں اتنی توانائی پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کے تمام مسائل کے لئے ایک ایسا منصوبہ بنائے جو سب کو گھیرے ہوئے ہو اور اس کی زندگی کی تمام مصلحتوں پر منطبق ہو؟ یا یہ کہ انفرادی فکری منصوبہ بندی کی توانائی صرف جزئی اور لامحدود مسائل کے دائرہ میں ہے اور زندگی کی تمام مصلحتوں پر احاطہ جس میں ہر قسم کی سعادت اور خوش بختی موجود ہو عقلی طاقت کے بس کی بات نہیں ہے؟

بعض فلسفی اس طرح کی "خودکفائی" کے معتقد ہیں، انہوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ہم نے سعادت وشقاوت کے راستوں کا انکشاف کر لیا ہے، اور ہم عقل وارادہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے کو خوش نصیب بنالیں گے۔

لیکن اس کے باوجود دنیا میں ایسے دو فلسفی نہیں مل سکیں گے جو اس راستہ کو ڈھونڈ نکالنے میں یکساں خیالات رکھتے ہوں، بلکہ صورت حال یہ ہے کہ خود سعادت جو اصلی اور آخری مقصد ہے اور سرسری نظر میں اس کا مفہوم واضح اور بدیہی معلوم ہوتا ہے، ان کے نزدیک مبہم ترین مفاہیم میں سے ایک ہے، یہ مسئلہ کہ سعادت کیا ہے؟ اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ ابھی تک ان فلسفیوں کے درمیان ایک مجہول مسئلہ کی شکل میں موجود بحث ہے، اور اس کا مفہوم واضح نہیں ہو سکا، کیوں؟ اس لئے کہ ابھی تک خود انسان اور اس کی استعدادوں اور صلاحیتوں کی معرفت نہیں ہو سکی ہے۔

یہ بات ممکن نہیں ہے کہ خود انسان کی معرفت کے بغیر یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی سعادت کیا ہے اور

کن چیزوں کے ذریعے نصیب ہو سکتی ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ انسان ایک معاشرتی موجود ہے، سماجی زندگی اسکے لئے ہزاروں مسائل اور مشکلات پیدا کردیتی ہے۔ اس کا فریضہ ہے کہ ان تمام مشکلات کو حل کرے اور ان تمام مسائل کے مقابلہ میں اپنے فرائض کا تعین کرے اور چونکہ وہ معاشرتی موجود ہے لہذا اس کی سعادت وخوش بختی، اس کے ارمان، اس کے خیروشر کے معیار، اس کی راہ وروش، اس کے ذرائع کا انتخاب، دوسروں کی سعادتوں، ارمانوں خیروشر کے معیاروں، راہ وروشوں اور ذرائع کے انتخاب کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، دوسرے سے الگ ہو کر اپنا راستہ منتخب نہیں کیا جاسکتا، اس کو اپنی سعادت کو اسی شاہراہ پر ڈھونڈنا چاہیے جو معاشرہ کو سعادت وکمال تک پہنچادے۔

اور اگر ابدی زندگی، روح کی جاودانیت اور عقل کی ناتجربہ کاری کے مسائل کو دنیاوی زندگی اور نشاۃ کی نسبت سے دیکھنا چاہیں تو مسئلہ اور بھی مشکل اور پیچیدہ ہوجائیگا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ایک مکتب، نظریہ اور آئیڈیالوجی کی ضرورت واضح ہوجاتی ہے۔ اس کتب سے ہماری مراد ایک ایسا کلی نظریہ، جامع، ہم آہنگ اور منسجم منصوبہ ہے جو انسان کے اصل مقصد کو کامل اور ہر شخص کو خوش نصیبی وسعادت سے ہمکنار کرا سکے اور اس منصوبہ میں بنیادی خطوط اور روشیں، واجبات ومحرمات، اچھائیاں اور برائیاں، مقاصد اور ذرائع، بیماریاں اور علاج، ذمہ داریاں اور فرائض پورے طور پر واضح ہوں اور وہ منصوبہ تمام لوگوں کے لئے ذمہ داریوں اور فرائض کے الہام کا سرچشمہ ہو۔

انسان اپنی خلقت کے ابتدائی ایام سے کم از کم اس زمانہ سے جبکہ سماجی زندگی کی وسعت اور ارتقاء میں کچھ اختلافات کا سبب بنی۔ ایک آئیڈیالوجی اور مکتب فکر اور قرآن کی اصطلاح میں شریعت کا محتاج تھا۔ جتنا زمانہ گزرتا گیا اور انسان ترقی وکمال کے مراحل طے کرتا گیا اس ضرورت کا احساس اور بھی زیادہ شدید ہوتا گیا۔ ماضی میں خونی، نسلی، خاندانی، قبائلی اور قومی رجحانات انسانی معاشروں

پر ایک اجتماعی روح'' کی مانند حاکم تھے۔ یہ روح اپنے لحاظ سے کچھ، اجتماعی ارمانوں اور عقائد کو (چاہے وہ غیر انسانی ہی ہوں) ایجاد کرتی تھی اور وہ معاشرہ کو متحد کر کے ایک راستہ پر گامزن کرتی تھی۔ علمی ترقیوں نے رشتوں کو کمزور بنادیا۔ اپنی ذاتی خصوصیات کی بناء پر علم کا جھکاؤ انفرادیت کی جانب ہے، اس لئے وہ محبتوں اور عطوفتوں کو کم اور رشتوں کو کمزور بناتا ہے۔ اس دور کے انسان کو (اور مستقبل کے انسان کو بدرجہ اولیٰ) جو چیز اتحاد اور یکتائی عطا کرتی، مشترکہ ارمان دیتی اور اس کے لیے خیروشر، واجب وحرام کا معیار بنتی ہے، وہ زندگی کا ایک فلسفہ ہے جس کو سمجھ بوجھ کر انتخاب کیا گیا ہو، جو منطق واستدلال سے آراستہ ہو اور ارمان خیز ہو یا بالفاظ دیگر ایک جامع اور مکمل آئیڈیالوجی ہو۔ اس طرح کے فلسفہ کے لئے آج کے انسان کی احتیاج ماضی کے انسان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ ایسا فلسفہ جو انسان میں فرد اور انفرادی مفادات کے ماوراء حقائق سے عشق پیدا کرسکے، آج اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے کہ مکتب اور آئیڈیالوجی سماجی زندگی کی ضروریات میں سے ہے۔

کس میں اتنی توانائی ہے جو اس قسم کے مکتب کو ایجاد کرسکے اور اس کا منصوبہ بنا سکے؟ بیشک ایک فرد کی عقل اس کام کو انجام دے ہی نہیں سکتی، تو کیا چند عقلیں مل جل کر اس اہم کام کو انجام دے سکتی ہیں؟ کیا انسان اپنے تمام گزشتہ اور موجود تجربوں اور معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قسم کا منصوبہ بنا سکتا ہے؟ اگر انسان ابھی تک خود اپنے آپ کو نہیں پہچان سکا ہے، اور اس کی نظر میں سب سے زیادہ مجہول چیز خود انسان ہی ہے، تو انسانی معاشرہ اور معاشرتی سعادت بدرجہ اولیٰ اس سے بھی زیادہ مجہول ہونا چاہئے، ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ یہی وہ مقام ہے کہ اگر ہم کائنات اور تخلیق کے بارے میں صحیح نظریہ رکھتے ہوں نظام ہستی کو ایک معتدل نظام سمجھتے ہوں، ہستی اور وجود میں خلاء اور بے مقصدیت کے قائل نہ ہوں تو ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس عظیم نظام خلقت نے سب سے زیادہ اہم ضرورت اور احتیاج کو یونہی چھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے

انسانی عقل کے افق سے کہیں زیادہ بلند وبالا افق یعنی وحی کے افق سے اس شاہراہ کے بنیادی اور اصلی خطوط کو مشخص کر دیا ہے (اصل نبوت) عقل اور علم کا کام یہ ہے کہ وہ انہی بنیادی اور اصلی نقوش کے دائرہ میں قدم بڑھائیں، بوعلی سینا نے اپنی کتاب ''نجات'' میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ انسان ایک ایسی شریعت الٰہی کا محتاج ہے جس کو ایک انسان (نبی) کے وسلیہ سے بیان کیا گیا ہو، کتنی اچھی بات کہی ہے! وہ کہتے ہیں

فالحاجة انی هذ الانسان فی ان یبقی نوع الانسان ویتحصل وجوده اشد من الحاجة الیٰ انبات الشعر علیٰ الحاجة الیٰ انبات اشعر علیٰ الحاجبین و تقصیر الاخمص من القدمین و اشیاء اخریٰ من المنافع التّی لاضرورة الیهانی البقاء بل اکثر مالها انها تنفع فی البقاء''.

نوع انسانی کی بقاء اور انسان کو اس کے انسانی وجود کو کمال تک پہنچانے، الٰہی شریعت اور انسانی مکتب کو بیان کرنے لئے نبی کی ضرورت، ابروؤں پر بال اگانے اور دونوں پیروں کو گڑھے دار بنانے اور اسی قسم کے ان دوسرے مفادات کی احتیاج سے کہیں زیادہ ہے جو صرف نوع انسان کی بقاء کے لئے مفید ہیں لیکن نوع انسان کی بقاء کیلئے ضروری اور لازمی نہیں ہیں۔

یعنی جب خلقت کی اس انتظامیہ نے چھوٹی چھوٹی اور غیر ضروری احتیاجات کو مہمل نہیں چھوڑا ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اس سب سے زیادہ ضروری احتیاج کو برطرف کئے بغیر چھوڑ دے؟

لیکن اگر ہم وجود اور تخلیق کے بارے میں ایک صحیح نظریہ سے محروم ہوں تو ہم کو یہ بات تسلیم کر لینی پڑے گی کہ انسان کی قسمت ہی میں گمراہی اور ضلالت لکھی ہوئی ہے کیونکہ طبیعت کے اس ظلمتکدہ میں سرگردان انسان کی بنائی ہوئی کوئی بھی آئیڈیالوجی اور منصوبہ، سرگردانی، حیرانی اور پریشانی کے علاوہ کوئی اور فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ایک مکتب اور آئیڈیالوجی کا وجود ضروری ہے۔ اسی

طرح سے یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مکتب اور آئیڈیالوجی سے وابستہ اور ملحق ہوجائے۔

لیکن فرد کا کسی مکتب اور آئیڈیالوجی سے وابستہ اور ملحق ہونا اس وقت واقعی صورت اختیار کرتا ہے جبکہ یہ وابستگی ''ایمان'' کا روپ اختیار کرلے اور ایمان ایسی ایک حقیقت ہے جو طاقت کے سہارے اور مصلحت کی خاطر حاصل نہیں ہوسکتا، طاقت کے زریعے کسی مطلب کو منوایا اور دوسروں کو جھکایا جاسکتا ہے، لیکن آئیڈیالوجی سر جھکانے کا نام نہیں، آئیڈیالوجی دل سے قبول کرنے اور جذب ہوجانے کی چیز ہے۔ آئیڈیالوجی کے لئے ایمان کی ضرورت ہے۔ ایک مفید اور کارآمد آئیڈیالوجی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک طرف سے ایک قسم کی جہاں بینی پر تکیہ رکھتی ہوتا کہ عقل کو قانع اور فکر کے لئے غذا فراہم کرسکے، اور دوسری طرف سے وہ اپنی جہاں بینی سے منطقی اور کچھ ایسے مقاصد کو حاصل کرے، جن میں کشش اور جاذبیت موجود ہوتا کہ ایسی صورت میں عشق واقناع جو ایمان کے دو بنیادی عنصر ہیں آپس میں مل جل کر دنیا کو تعمیر کرنے کے قابل ہوجائیں۔

گفتگو کے اس مرحلہ میں کچھ مسائل ہیں جن کو بطور اختصار اور اجمال بیان کرنا ضروری ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کسی دوسرے وقت ہی ممکن ہوگی۔

الف: آئیڈیالوجی (نظریات) دو طرح کے ہوتے ہیں۔ انسانی اور گروہی، انسانی آئیڈیالوجی وہ نظریات ہیں جن کی خاطر تمام نوع انسان ہیں نا کوئی قوم یا نسل یا کوئی طبقہ یہ نظریہ تمام نوع انسان کی نجات کے دعویدار ہوتے ہیں اور کسی خاص طبقہ یا گروں کی نجات کا منصوبہ پیش نہیں کرتے وہ تمام انسانوں کو شامل کیے ہوتے ہیں۔ صرف کسی مخصوص طبقہ کو نہیں اس کے حامی کسی مخصوص طبقہ گروں یا قوم کے افراد کی بجائے ہر گروں اور ہر قوم کے لوگ ہوتے ہیں اس کے برعکس گروہی آئیڈیالوجی کا مخاطب ایک مخصوص گروں یا طبقہ ہوتا ہے اور وہ فقط اسی گروں کی نجات اور قیادت کا مدعی ہوتا ہے وہ جو منصوبہ بھی پیش کرتا ہے وہ اسی گروں کے لیے مخصوص ہوتا ہے اس کے حامی بھی

صرف اسی گروں میں پائے جاتے ہیں وہ اپنے سپائیوں کا صرف اسی گرو میں سے انتخاب کرتا ہے

ان دو میں سے ہر ایک نظریہ انسان کے بارے میں ایک خاص طرز فکر پر مبنی ہے، عام اور انسانی نظریہ جیسے اسلامی نظریہ انسان کے مطلق ایسی معرفت کا حامل ہے جسے فطرت کہا جاتا ہے، اسلام کی نظر میں انسان خلقت ہی کے موقع پر، تاریخی اور معاشرتی عوامل واثباب کی تاثیر سے پہلے ایک مخصوص وجودی پہلو کا مالک ہوگیا، اور اس کو ایسی عظیم استعدادیں دی گئیں ہیں جو اس کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے اور اس کو ہویت عطا کرتی ہے۔

اس نظریہ کے مطابق انسان خلقت کے موقع پر ہی ایک قسم کے شعور اور ''نوعی ضمیر'' سے جو ہر انسان میں موجود ہے، بہرہ مند ہوگیا اور اسی فطری وجدان نے اس کو ''نوعی تعین'' انسان بننے، مخاطب واقع ہونے، تحرک وتحریک اور دعوت کی صلاحیت دی ہے، ایسے مکاتب فکر نوع انسان کے مشخص فطری ضمیر پر تکیہ کرتے ہوئے اپنی دعوت کا آغاز اور تحریک کو شروع کرتے ہیں۔

بعض آئیڈیالوجی انسان کے بارے میں کسی اور طرز فکر کی حامل ہوتی ہیں۔ ان آئیڈیالوجیوں کی نظر میں نوع انسان میں مخاطب قرار پانے، تحریک وتحرک اور دعوت کی صلاحیت نہیں پائی جاتی کیونکہ انسان کے تمائلات، ضمیر وشعور، قومی زندگی میں تاریخ عوامل کے زیر اثر یا انسان کے طبقاتی موقف میں سماجی عوامل کے زیر اثر مشخص ہوتے ہیں۔ تاریخی یا مخصوص سماجی عوامل واسباب سے قطع نظر انسان کے پاس شعور ہے اور نہ ضمیر، اور نہ دعوت کا مخاطب قرار پانے کی صلاحیت، بلکہ وہ عینی وجود ہونے کی بجائے ایک انتزاعی موجود ہے، مارکس ازم اور اسی طرح کے قوی، فلسفہ کی بنیاد انسان کے بارے میں اسی قسم کے انداز فکر پر قائم ہے، ان فلسفوں کی خدنگاہ طبقاتی مفادات یا قومی ونسلی، احساسات یا زیادہ سے زیادہ قومی ثقافت تک ہی محدود ہے۔

بیشک اسلامی مکتب فکر پہلی قسم میں سے ہے، اس کی حد نظر انسان کی فطرت ہے۔ لہذا اسلام کے مخاطب ''الناس'' سب لوگ ہیں (۱) کوئی خاص طبقہ اور گروہ نہیں، اسلام نے عملی طور پر گروہ کے

درمیان سے اپنا حامی اور مددگار پیدا کرلیا ہے۔ حتی کہ اس طبقہ کے درمیان سے بھی جس سے جنگ کرنے کے لئے کمر باندھے ہوئے ہے یعنی قرآن کی اصطلاح میں مترف (سرکش سرمایہ دار) اور ملاء (سردار) طبقہ، ایک طبقہ سے خود اسی طبقہ کیخلاف ایک گروہ سے خود اسی گروہ کے مفادات کیخلاف جنگ کرنے کے لئے پیاہی بھرتی کرتا ہے، بلکہ ایک شخص کو خود اپنی برائیوں اور تباہ کاریوں کے خلاف ابھارنا ایسا کام ہے جس کو اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں بہت زیادہ انجام دیا ہے اور انجام دے رہا ہے۔ اسلام چونکہ ایک دین ہے اور انسان کے وجود کی گہرائیوں تک اس کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں، اور دوسری طرف سے انسان کی انسانی فطرت پر تکیہ کرتا ہے اس لئے اس میں اتنی توانائی ہے کہ فرد کو خود اپنی بدکاریوں کے خلاف برسر پیکار کردے اور اس بات پر مجبور کردے کہ وہ خود اپنے ہی خلاف وہ انقلاب لائے جس کا نام ''توبہ'' ہے، گروہی، آئیڈیالوجیوں میں صرف اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ایک فرد کو دوسروں کے خلاف یا ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے خلاف بھڑکادیں، لیکن ان میں نہ تو اتنی طاقت ہے کہ وہ فرد کو خود اپنے خلاف انقلاب لانے کے لئے آمادہ کرسکیں اور نہ ہی یہ توانائی ہے کہ فرد کو اپنے اندر خود اپنا محافظ بنا سکیں۔

(۱) بعض اوقات اس کلمہ کے مفہوم میں جو کہ ''تمام لوگ'' کے معنی میں ہے غلطی کی جاتی ہے اور اس کو ''عوام'' کے معنی میں جو کہ ممتاز طبقہ کے مقابلے میں سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ اسلام کا مخاطب ''الناس'' ہے لہذا دعوی کیا جاتا ہے کہ دین اسلام عوامی دین ہے اور ضمناً اسلام کے لیے اس کو فضیلت سمجھتے ہیں لیکن یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ جو چیز حقیقت ہے اور اسلام کے لیے فضیلت بھی ہے یہ ہے کہ اسلام عوام کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ نہ یہ کہ وہ صرف عوام کو اپنا مخاطب بناتا ہے اور اس کی آئیڈیالوجی طبقاتی اور گروہی آئیڈیالوجی ہے، اور جو چیز سب سے زیادہ فضیلت کا سبب ہے وہ یہ ہے کہ استحصال شدہ طبقہ کے علاوہ خود استحصال کرنے والا طبقہ اور سرمایہ داروں میں سے بعض ضمیروں کو کبھی کبھی انسانی فطرت پر تکیہ کرتے ہوئے استحصال شدہ طبقہ کے حق میں جھنجھوڑ دیا ہے۔

چونکہ اسلام مذہب بھی ہے اور آخری دین بھی اس لئے وہ تمام آسمانی مذاہب سے بڑھ کر اجتماعی عدل کو برقرار کرنے کے لئے آیا ہے۔ اور فطری طور پر اس کا مقصد محروموں او مستضعفوں کو نجات دلانا اور دستمگروں کے ساتھ جنگ کرنا ہے، لیکن اسلام کے مخاطب صرف محروم اور مستضعف لوگ ہی نہیں اسی طرح سے اس کے حامی اور مددگار صرف اس طبقہ میں نہیں بلکہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام نے ایک طرف سے مذہب کی طاقت اور دوسری طرف سے انسانی فطرت پر اعتماد کرتے ہوئے ان طبقوں تک کے درمیان سے اپنے سپائیوں کو منتخب کیا ہے، جن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے کمر باندھے ہوئے ہے۔ اسلام حیوانیت پر انسانیت، جہل پر علم، ظلم پر عدل، ناحق امتیازوں پر مساوات، رذالت پر فضیلت، گناہوں سے لاپرواہی پر تقوی، نیز شرک پر توحید کی کامیابی کا نظریہ ہے۔ جباروں اور متکبروں پر مستضعفوں کی کامیابی اور غلبہ انہی کامیابیوں کے مصداقوں میں سے ایک مصداق ہے۔

(ب) اس گفتگو کے بعد یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کیا اصلی انسانی ثقافت کی ماہیت ایک ہے؟ یا یہ کہ ایک متحد ثقافت کا وجود ہے ہی نہیں بلکہ اس ثقافت کی ماہیت قومی، ملی، یا طبقاتی ہے جو کچھ اس وقت موجود ہے یا مستقبل میں ایجاد ہوگا، وہ کئی متعدد ثقافتیں ہیں۔

یہ مسئلہ بھی اسی بات سے وابستہ ہے کہ آیا نوع انسان ایک منفرد او اصیل فطرت سے برخوردار ہے اور یہی منفرد اور اصیل فطرت انسانی ثقافت کو اتحاد اور یکتائی عطا کرتی ہے یا اس طرح کی منفرد فطرت موجود ہی نہیں ہے بلکہ ثقافتوں کو تاریخی، قومی اور جغرافیائی اسباب وعوامل نے بنایا ہے اور یا طبقاتی منفعت طلب رجحانات نے اس کو ایجاد کیا ہے۔ چونکہ اسلام اپنی جہاں بینی میں ایک اور تنہا فطرت کا قائل ہے لہذا ایک تنہا آئیڈیالوجی کا بھی طرفدار اور ایک منفرد ثقافت کا بھی حامی ہے۔

(ج) بدیہی ہے کہ صرف ایک انسانی آئیڈیالوجی نہ کہ گروہی آئیڈیالوجی اور ایک تنہا آئیڈیالوجی نہ وہ آئیڈیالوجی جو انسان کے تجزیہ اور تقسیم کی بنیاد پر ہو ایک فطری آئیڈیالوجی جو مفاد پرست

آئیڈیالوجی نہ ہو، وہی انسانی اقدار پر تکیہ کر سکتی ہے اور انسان کی ماہیت کی مالک ہوسکتی ہے۔

(د) کیا ہر آئیڈیالوجی زمان ومکان سے وابستہ ہے؟ کیا انسان مجبور ہے کہ ہر بدلتے ہوئے زمانہ اور مختلف قسم کے ماحول ومکان میں ایک مخصوص مکتب فکر سے وابستہ رہے (یعنی انسان مجبور ہے کہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا جائے اس کا ماحول اور رہن سہن کی جگہ بدلتی جائے ویسے ویسے اپنے مکتب فکر کو بھی تبدیل کرتا جائے اور ایک نئی آئیڈیالوجی اپنالے)۔ کیا آئیڈیالوجی پر (جغرافیائی منطقہ کے مطابق) اصل اختلاف اور (زمان کے مطابق) اصل نسخ وتبدیل حکم فرما ہے؟ یا یہ کہ جس طرح سے انسان کی آئیڈیالوجی گروہی اعتبار سے ایک اور منفرد ہے اسی طرح زمانی اور مکانی لحاظ سے بھی بیگانہ یعنی واحد ومتحد ہے، بالفاظ دیگر جس طرح سے گروہی نقطہ نظر سے عام ہے نہ کہ خاص ، زمانی اور مکانی نقطہ نظر سے بھی مطلق ہے نہ کہ نسبی۔ کسی نظریہ کا زمانی اور مکانی لحاظ سے مطلق یا نسبی ہونا۔ یہ خود اپنی جگہ ایک نظر سے اس چیز سے وابستہ ہے کہ اس کا سرچشمہ انسان کی نوعی فطرت ہو، اور اس کا مقصد نوع انسان کی سعادت ہو، اور یا اس کا سرچشمہ گروہی مفادات اور قومی و طبقاتی احساسات ہوں۔

اور دوسری نظر سے یہ مسئلہ اس چیز سے وابستہ ہے کہ ہم معاشرتی تحولات اور تبدیلیوں کی ماہیت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا جب کسی معاشرہ میں تبدیلی آتی ہے اور وہ ایک دور کو طے کر کے نئے دور میں داخل ہو جاتا ہے تو اس معاشرہ کی ماہیت بدل جاتی ہے اور نتیجہ میں اس پر ایسے قوانین حکم فرما ہو جاتے ہیں جو گزشتہ حکم فرما قوانین سے مغائر اور مختلف ہوتے ہیں جیسے پانی، حرارت کے ایک معینہ درجہ تک پہنچ کر بخارات میں بدل جاتا ہے، اور اس کے بعد اس پر مائعات کے قوانین کی بجائے گیس کے قوانین حکم فرما ہو جاتے ہیں، یا یہ کہ سماجی تبدیلیاں اور ترقیاں، اس قسم کی نہیں، بلکہ معاشرے کے اصلی ارتقائی قوانین اور وہ مدار جس میں معاشرہ تبدیل ہوتا ہے اپنی جگہ پر باقی ہیں۔ معاشرے میں صرف منزل اور مرحلہ کے اعتبار سے تبدیلی واقع ہوتی ہے ، نہ کہ محور اور ارتقاء کے

قانون کے لحاظ سے جس طرح کہ تمام جاندار زندگی کے لحاظ سے تبدیلی اور ترقی کرتے ہیں لیکن ترقی اور کمال کے قوانین ہمیشہ اپنی جگہ پر باقی ہیں۔

اور ایک نظر سے یہ مسئلہ کہ ایک آئیڈیالوجی زمانی اور مکانی لحاظ سے مطلق ہے یا نسبی۔ اس مسئلہ سے وابستہ ہے کہ اس آئیڈیالوجی کی جہاں بینی کیا ہے؟ علمی یا فلسفی اور مذہبی، چونکہ علمی آئیڈیالوجی ایک غیر مستحکم اور ناپائیدار، جہاں بینی پرمبنی ہوتی ہے اس لئے وہ خود بھی پائیدار اور مستحکم نہیں ہوسکتی، اس کے برعکس وہ فلسفی جہاں بینی جو اصول اولیہ اور بدیہیات اولیہ پرمبنی ہو، یا مذہبی جہاں بینی جو وحی ونبوت پر استوار ہو، پائیدار ثابت ہوتی ہے۔

یہاں جس طرح سے اس بات کی فرصت نہیں ہے کہ فطرت کے مسئلہ پر گفتگو کی جائے جو اسلامی معارف کی ''ام المسائل'' ہے۔ اس طرح معاشرہ کی تبدیلیوں اور تحولات کے سلسلہ میں بھی بحث وگفتگو کرنے کی فرصت نہیں۔ لیکن اس کتاب کے چوتھے حصہ میں جہاں معاشرہ اور تاریخ کے بارے میں بحث وگفتگو کی جائے گی وہاں معاشرہ کی تبدیلیوں وتحولات اور فطرت کے ساتھ اس کے رابطہ کے بارے میں بھی تحقیقی بحث ہوگی۔

(ھ) خود آئیڈیالوجی پر اصل ثبات حکم فرما ہے یا اصل تغییر؟ ابھی تک گفتگو اس سلسلہ میں ہو رہی تھی کہ کیا مختلف زمانوں یا مختلف مکانوں میں انسان کا نظریہ مختلف ہوتا ہے؟ گویا پہلے نظریہ کی تبدیلی اور منسوخ ہونے کے بارے میں بحث وگفتگو تھی، لیکن اب ہمارے سامنے ایک دوسرا مسئلہ درپیش ہے اور وہ مسئلہ ایک آئیڈیالوجی اور نظریہ کی تبدیلی اور تحول سے متعلق ہے، مسئلہ یہ ہے کہ آئیڈیاجی خواہ مفہوم کے لحاظ سے ہو، عام ہو یا خاص، مطلق ہو یا نسبی، چونکہ وہ خود، ایک نومولود چیز ہے اور تمام نومولود چیزیں متغیر ومتحول اور ارتقاء کی راہ پر رواں ہیں لہذا آئیڈیالوجی بھی ہمیشہ متغیر اور متحول رہتی ہے؟ کیا ایک نظریہ کی وہ حقیقت جو پیدائش کے دن ہوتی ہے اس حقیقت سے مختلف ہوتی ہے جو رشد ونمو اور ترقی کے دوران ہوتی ہے؟ یعنی ہمیشہ اس کی اصلاح ہوتی ہے، اس کی

خامیوں اور لغزشوں کو دور کیا جاتا ہے، اور ہمیشہ قائدین اور اس آئیڈیالوجی کے ماہرین اس میں تجدید نظر کرتے ہیں۔ (جیسا کہ اس زمانہ کی مادی آئیڈیالوجیوں میں یہ بات نظر آتی ہے) ورنہ وہ بہت جلد پرانی اور بوسیدہ ہوجائے گی اور اپنی صلاحیت کو کھو بیٹھے گی؟ یا یہ ممکن ہے کہ آئیڈیالوجی کو اس طرح سے منظم کیا گیا ہو نیز اس میں انسان اور معاشرہ کے تحرک کے بنیادی داخلی نقوش پر اس طرح سے بھروسہ کیا گیا ہو کہ اس میں قائدین کی طرح سے کسی قسم کی تجدید نظر واصلاح کی ضرورت نہ ہو بلکہ قائدین اور آئیڈیالوجی کے ماہرین کا کام صرف یہ ہو کہ وہ اس کے مفاہیم میں ''اجتہاد'' کریں اور نظریہ کی ترقی خود نظریہ کی بجائے اس کے اجتہاد کے میدانوں میں ہو؟

اس سوال کا جواب بھی گزشتہ سوالات سے واضح ہوچکا ہے۔

اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر مکتب

اسلام جو کہ اس قسم کہ جہاں بینی کی بنیاد پر قائم ہوا ہے ایک جامع اور حقیقت پسند مکتب ہے اسلام میں تمام انسانی ضروریات پر توجہ دی گئی ہے، چاہے وہ دنیاوی ہوں یا اخروی، جسمانی ہوں یا روحانی، عقلی وفکری ہوں یا احساسی وعطوفتی، فردی ہوں یا سماجی۔

اسلامی تعلیمات ایک لحاظ سے مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔

(ا) اصول عقائد، یعنی وہ چیزیں جن کے سلسلہ میں عقائد کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا ہر فرد کا فریضہ ہے، اس سلسلہ میں جو کام انسان کے ذمہ ہے وہ تحقیقی اور علمی کاموں میں سے ہے۔

(ب) اخلاقیات، یعنی ایسی خصلتیں جن کے لئے ہر مسلمان شخص پر واجب ہے کہ وہ خود کو ان خصلتوں اور خوبیوں سے سنوارے اور ان کی اضداد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے، اس سلسلہ میں جو کام انسان کے ذمہ ہے وہ نگہداری یعنی مراقب نفس اور خودسازی یعنی اصلاح نفس کی قسم سے ہے۔

(ج) احکام، یعنی وہ قوانین جو انسان کے بیرونی اور عینی کاموں سے تعلق رکھتے ہیں خواہ وہ کام معاشی ہو یا معادی، دُنیوی ہو یا اخروی، انفرادی ہو یا سماجی۔

اسلامی اصول عقائد، مذہب شیعہ کے مطابق پانچ اصول ہیں۔

توحید، عدل، نبوت، امامت، قیامت۔

اسلام اصول عقائد کے سلسلے میں تقلید اور تعبد کو کافی نہیں سمجھتا، کیونکہ اس سلسلہ میں ہر شخص کا فریضہ ہے کہ وہ ان کے بارے میں صحیح عقید کو اپنائے۔ اسلام ضروری سمجھتا ہے کہ ہر شخص پوری آزادی کے ساتھ خود ان عقائد کی حقانیت اور ان کے صحیح ہونے کے بارے میں تحقیق کرے۔ اسلام کی نظر میں عبادت، نماز، روزہ جیسی جسمانی عبادت یا خمس وزکواۃ جیسی مالی عبادات میں منحصر نہیں ہے بلکہ ایک دوسری قسم کی بھی عبادت ہے، اور وہ فکری عبادت ہے، تفکر یا فکری عبادت اگر انسان کی بیداری اور متنبہ کے لئے ہو تو برسوں کی جسمانی عبادت سے بہتر ہے۔

قرآن کے نقطہ نظر سے فکری لغزش کے مقامات

وہ قرآن جو تفکر اور فکری نتائج حاصل کرنے کے لئے دعوت دیتا ہے اور فکر کرنے کو عبادت سمجھتا ہے، نیز اصول عقائد کے حصول کو منطقی تفکر کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے صحیح نہیں سمجھتا اس نے ایک بنیادی بات کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ کہ انسان کہاں کہاں فکری لغزشیں کرتا ہے اور ان کا سرچشمہ کیا ہے؟ غلطیوں اور گمراہیوں کا اصل سبب کیا ہے؟ اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ صحیح فکر کرے غلطی اور گمراہی سے دوچار نہ ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟ چنانچہ قرآن میں کچھ چیزیں غلطیوں اور گمراہیوں کے اسباب کے عنوان سے بیان ہوئی ہیں، جن کو آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

ا۔ علم ویقین کی بجائے ظن وگمان پر تکیہ کرنا

قرآن کہتا ہے۔

''اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کی پیروی کرنا چاہو تو وہ تم کو راہ حق سے گمراہ کردیں گے، کیونکہ وہ لوگ ظن اور گمان پر تکیہ کرتے ہیں (نہ کہ یقین پر اور صرف اندازے وتخمینے سے کام کرتے ہیں''۔

قرآن کریم بہت سی آیتوں میں ظن وگمان کی پیروی کی بہت شدت کے ساتھ مخالفت کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا ہے: (سوۃ الاسریٰ ۳۰)

''جب تک کسی چیز کے بارے میں علم ویقین نہ حاصل کرلو، اس کی پیروی نہ کرو۔

آج فلسفی نقطہ نظر سے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ غلطیوں اور لغزشوں کے اہم اسباب میں سے ایک سبب یہی ہے، قرآن کے ایک ہزار سال بعد ڈیکارٹ نے اپنے استدلال کی پہلی اصل سی چیز کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''میں کسی چیز کو اس وقت تک حقیقت نہیں سمجھتا ہے جب تک کہ وہ چیز مجھ پر بدیہی نہ ہوجائے میں جلد بازی، رجحان اور ذہن کی سبقت سے پرہیز کرتا ہوں، کسی چیز کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک وہ مجھ پر اس قدر واضح اور روشن نہ ہوجائے کہ میرے لئے اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ رہ جائے۔

۲۔ نفسانی خواہشات

انسان کو اگر صحیح فیصلہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ جس مطلب کے بارے میں فکر کر رہا ہے اس کے سلسلہ میں غیر جانبداری کو پوری طرح ملحوظ رکھے رہے، یعنی وہ اس بات کی کوشش کرے کہ حقیقت پسند رہے اور دلائل کے سامنے اس قاضی کی مانند سرِتسلیم خم کردے جو کسی مسئلہ کے بارے

میں تحقیق کررہا ہو۔ کیونکہ قاضی اگر کسی کی طرف پہلے ہی سے مائل ہوتو اسے لاشعوری طور پر وہ دلیلیں زیادہ پسند آئیں گی جو اس شخص کے حق میں ہیں۔ لیکن جو دلیلیں اس شخص کے خلاف اور دوسرے شخص کے حق میں ہوں گی وہ خود بخود قاضی کی نظروں سے گرجائیں گی اور یہی بات قاضی کی لغزش اور فیصلے میں غلطی کا سبب بن جائے گی۔

انسان اگر اپنے تفکرات میں کسی مطلب کے نفی یا اثبات کے بارے میں غیر جانبدار نہ رہے اس کی نفسانی خواہشات کسی ایک جانب ہوجائیں تو خواہ نخواہ لاشعوری طور پر اس کی فکر کا رخ اس کی نفسانی خواہشات کی جانب مڑ جائے گا، یہی وجہ ہے کہ قرآن گمان وظن پر بھروسہ کرنے کی طرح نفسانی خواہشات کو بھی لغزش کے اسباب میں سے شمار کرتا ہوا ہے۔ سورہ نجم (آیت ۲۳) میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنۡ یَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَھۡوَی الۡاَنۡفُس

"وہ صرف گمان اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں"

۳۔جلد بازی

ہر فیصلے اور اظہار نظر کے لئے کچھ دلائل اور دستاویزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب تک کسی مسئلے کے متعلق کافی ووافی دلائل ومدارک اکٹھے نہ ہوجائیں اس وقت تک اس سلسلہ میں کسی بھی قسم کا اظہار نظر، جلد بازی اور افکار کی لغزش کا سبب ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے بے شمار مقامات پر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض فیصلوں کے بارے میں انسان کا علمی سرمایہ کم اور ناکافی ہے اس لئے اس نے ان معاملات میں اظہار جرم ویقین کو احتیاط کے خلاف قرار دیا ہے۔ مثلا سورہ سراء (آیت ۷۵) میں فرماتا ہے۔

وَمَا اُوۡتِیۡتُمۡ مِنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا۔

"یعنی جس قدر عرفان وآگہی تم کو ملی ہے وہ کم ہے اور فیصلہ کے لئے کافی نہیں ہے۔"

امام جعفر صادق علیہ اسلام فرماتے ہیں: "خداوند عالم نے قرآن مجید میں اپنے بندوں کے لئے دو آیتوں کو مخصوص کیا ہے اور تنبیہ کی ہے کہ ایک یہ کہ جب تک کسی چیز کے بارے میں علم ویقین حاصل نہ کریں اس کی تصدیق (میں جلد بازی) نہ کریں اور دوسرے یہ کہ جب تک کسی چیز کے بارے میں علم حاصل نہ کرلیں، جب تک علم ویقین کے مرحلہ تک نہ پہنچ جائیں اس کا انکار (کرنے میں جلد بازی) نہ کریں۔ خداوند عالم ایک آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

اَلَمۡ یُؤۡخَذۡ عَلَیۡھِمۡ مِیۡثَاقُ الۡکِتَابِ اَنۡ لَا یَقُوۡلُوا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الۡحَقّ

کیا ان سے کتاب (کتاب فطرت یا آسمانی کتابوں) میں یہ عہد نہیں لیا گیا ہے کہ وہ خداوند عالم کی طرف اسکے علاوہ کسی اور چیز کی نسبت نہ دیں جو چیز حق ہے (اس کا حق ہونا ثابت ہو چکا ہے)

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ بَلۡ کَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ یُحِیۡطُوۡا بِعِلۡمِہٖ

انہوں نے اس چیز کا انکار کیا اور جھٹلایا جس کے علم پر ان کا احاطہ نہیں تھا (اور اس کو نہیں پہچانتے تھے)

۴۔قدامت پسندی

انسان طبع اوّل کے زیر اثر جب دیکھتا ہے کہ فلاں فکر، عقیدہ کو گزشتہ نسلیں مانتی تھیں تو وہ خود بخود تحقیق کئے بغیر اس کو قبول کر لیتا ہے۔ قرآن یاد دہانی کراتا ہے کہ اسلاف کے عقائد کو جب تک عقل کی ترازو پر خوب اچھی طرح تول نہ لو، قبول نہ کرو، اسلاف کے عقائد ے مقابلہ میں فکری استقلال سے کام لو۔ سورہ بقرآیت ۱۷۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا قِیۡلَ لَھُمُ اتَّبِعُوۡا مَا اَنۡزَلَ اللّٰہُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا اَلۡفَیۡنَا عَلَیۡہِ آبَائَنَا اَوَ لَوۡ کَانَ آبَاؤُھُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡئًا وَّلَا یَھۡتَدُوۡنَ۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خداوند عالم نے وحی کے ذریعے نازل کیا ہے اس کی اطاعت کروتو کہتے ہیں، نہیں، ہم اسی روش اور رسم ورواج کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلا

ف کو پایا ہے، کیا اگر ان کے آباؤ اجداد نہ کچھ سمجھتے تھے اور نہ سیدھے راستہ پر تھے۔ پھر بھی یہ ان ہی کی پیروی کریں گے؟!

۵۔ شخصیت پرستی

فکری لغزشوں کا ایک اور سبب شخصیت پرستی ہے۔ تاریخی یا معاصر کی عظیم شخصتیں چونکہ دلوں میں عظمت رکھتی ہیں اس لئے وہ دوسروں کے ارادے، عزائم اور افکار پر اثر انداز ہوتی ہیں اور درحقیقت وہ دوسروں کے ارادوں اور افکار کو مسخر کرلیتی ہیں۔ دوسرے لوگ اسی طرح سے سوچنے لگے ہیں جس طرح سے وہ عظیم شخصیتیں سوچتی ہیں۔ انہی چیزوں کا عزم کرتے ہیں جن کا عزم یہ شخصتیں کرتی ہیں۔ ان کے سامنے دوسرے لوگ اپنے ارادہ اور فکری استقلال سے محروم ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم ہم لوگوں کو فکری استقلال کی دعوت دیتا ہے اور بڑی شخصیتوں کی اندھی تقلید کو ابدی شقاوت کا باعث سمجھتا ہے۔ لہذا ان لوگوں کی زبان سے جو اس طریقہ سے گمراہ ہو گئے ہیں۔ نقل کرتا ہے کہ وہ قیامت کے دن کہیں گے:

رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَ ائَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیلا (احزاب ۶۷)

اسلام میں تفکر کے سرچشمے

قرآن جو کہ تفکر و تعقل کی دعوت دیتا ہے افکار کی لغزش کے رستوں کو بتانے کے علاوہ تفکر کے سرچشموں کی بھی نشاندہی کرتا ہے، یعنی ان موضوعات کو بھی بتاتا ہے جو اس کی شائستگی رکھتے ہیں کہ انسان ان موضوعات کے بارے میں فکر کرے اور ان سے اپنے عرفان و آگہی کے سرچشموں کے طور پر فائدہ اٹھائے۔

کلی طور پر اسلام میں ان مسائل کے بارے میں فکری طاقت کو صرف کرنے کی مخالفت کی گئی ہے جس کا نتیجہ فکر کو تھکا دینے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے اور یہی حکم ان مسائل کا ہے جن کے بارے

میں تحقیق کرنا ممکن تو ہو لیکن ان سے انسان کو کوئی فائدہ نہ ہو۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس علم کو عبث اور فضول قرار دیا ہے جس کے وجود سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو اور اس کے نہ ہونے سے کوئی نقصان بھی نہ ہوتا ہو لیکن وہ علوم جو قابل تحقیق بھی ہیں اور مفید بھی، اسلام ان کی پرزور تائید کرتا ہے اور لوگوں کو انکی جانب رغبت دلاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم مفید اور سودمند فکر کے لئے جن موضوعات کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان میں سے تین اہم موضوعات یہ ہیں۔

۱۔ طبیعت

پورے قرآن میں اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں طبیعت یعنی زمین، آسمان، ستارے، سورج، چاند، بادل، بارش، ہوا کا چلنا، سمندروں میں کشتیوں کا چلنا، نباتات، حیوانات اور آخر کار ہر اس محسوس چیز کو جس کو انسان اپنے اردگرد دیکھتا ہے، ایسے موضوعات کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ جس کے بارے میں پوری توجہ کے ساتھ غور و فکر اور تحقیق نیز اس سے نتیجہ حاصل کرنا چاہئے۔ بطور نمونہ ایک آیت ذکر کرتے ہیں۔

قُلِ انظُرُوْا مَاذَا فِی السَّموٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس ۱۰۱)

لوگوں سے کہہ دو کہ غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ آسمان اور زمینوں میں کیسی کیسی چیزیں ہیں؟

۲۔ تاریخ

قرآن میں بہت سی آئتیں ہیں جو گزشتہ اقوام کے حالات کو مطالعہ کرنے کی دعوت دیتی ہیں اور اس کو کسب علم کے ایک سرچشمہ کے طور پر متعارف کرواتی ہیں۔ قرآن کی نظر میں انسان کی تاریخ اور اس کے تحولات کچھ قوانین و نوامیس کے مطابق انجام پائے ہیں۔ تاریخی عزت و ذلت، شکست و کامیابی، خوش نصیبی اور بدنصیبی بہت ہی صحیح اور منظم حساب و کتاب رکھتی ہے۔ ان قوانین اور حساب و کتاب کو سمجھ کر تاریخ حاضر کو اپنے قبضے میں کرکے خود اپنی اور دور حاضر کے لوگوں کے سعادت و خوش

نصیبی کے لئے اس سے بہرہ مند ہوا جا سکتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک آیت (آلِ عمران ۱۳۷)

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۔

یعنی تم سے پہلے کچھ سنتیں اور قوانین عملا واقع ہو چکے ہیں۔ اس لئے زمین کی سیر کرو اور ماضی کے تاریخی آثار کے سلسلے میں چھان بین کرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان حقائق کو جھٹلاتے تھے جن کو میں نے وحی کے زریعے ان کے پاس بھیجا تھا۔

۳۔ انسان کا ضمیر

قرآن انسان کے ضمیر کو معرفت کے ایک مخصوص سرچشمہ کے عنوان سے یاد کرتا ہے، قرآن کی نظر میں پورا عالم تخلیق الٰہی آیتیں اور حقیقت کے انکشاف کے لئے نشانیاں اور آیتیں ہیں۔ قرآن انسان کی۔ بیرونی دنیا کو ''آفاق'' اور انسان کی داخلی دنیا کو ''النفس'' کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس طرح سے انسانی ضمیر کی مخصوص اہمیت کے بارے میں ٹھوک دیتا ہے۔ اسلام ادب میں '' آفاق اور نفس'' کی اصلاح یہیں سے نکلی ہے۔

جرمن فلسفی کانٹ کا ایک جملہ عالمی شہرت رکھتا ہے اور وہی جملہ اس کے سنگِ قبر پر کندہ ہے وہ کہتا ہے:۔

''دو چیزیں انسان کو حیرت میں ڈال دینے کے لئے کافی ہیں: ایک ستاروں بھرا آسمان جو ہمارے سروں پر جلوہ فگن ہے، دوسرے وہ ضمیر و وجدان جو ہمارے اندر موجود ہے۔''

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA

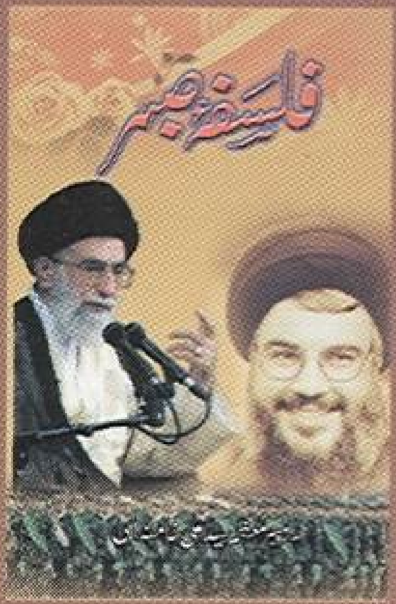

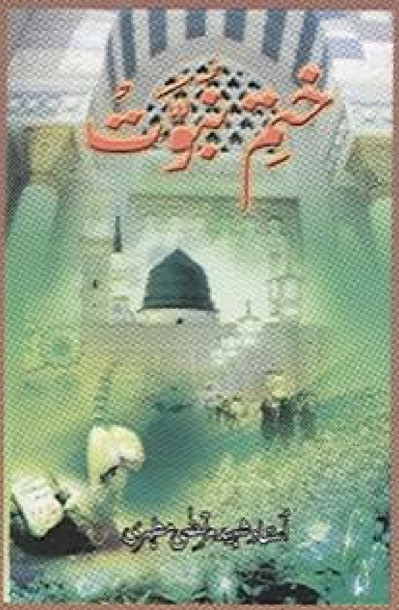

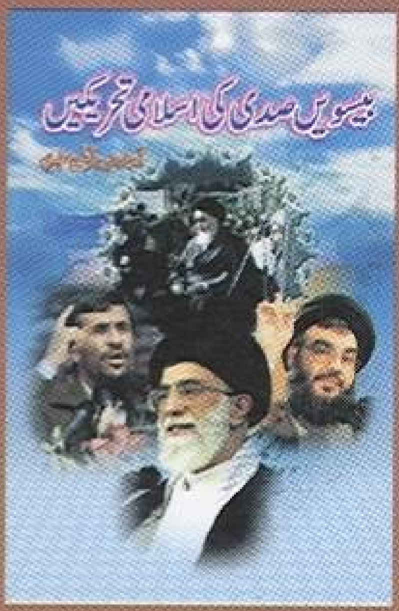

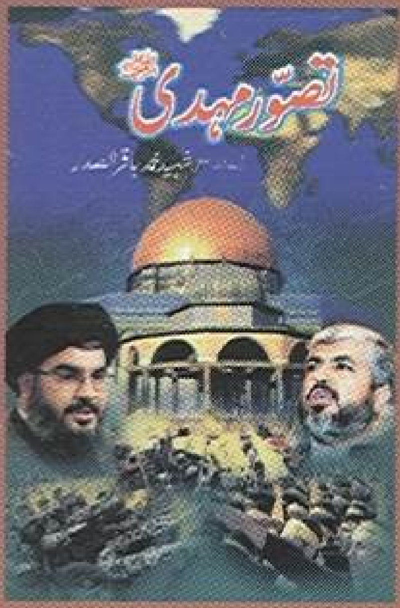

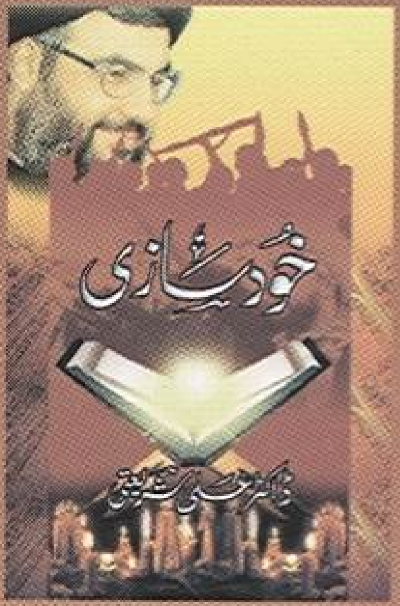

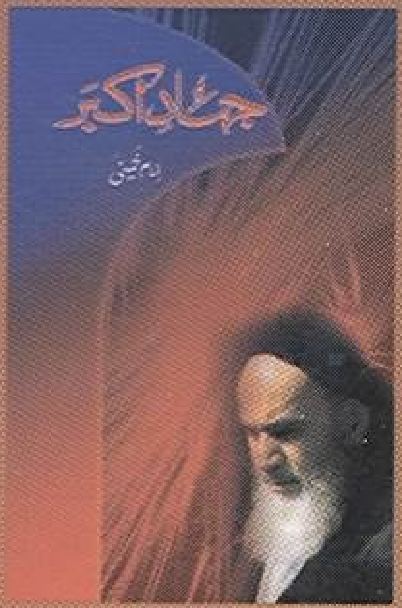

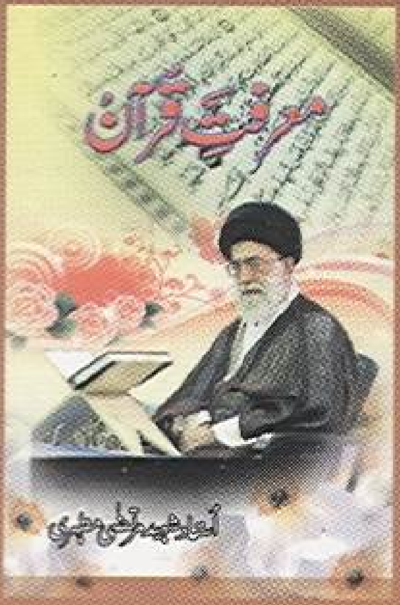

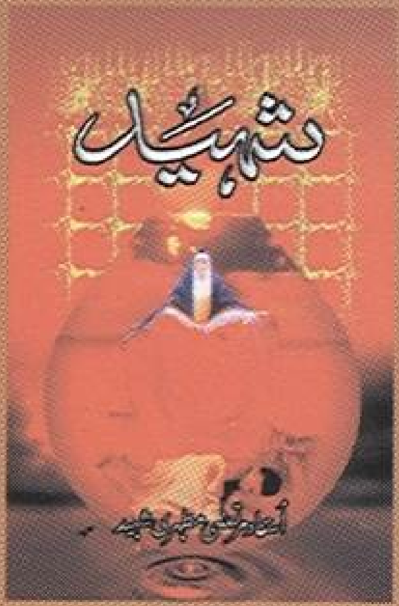

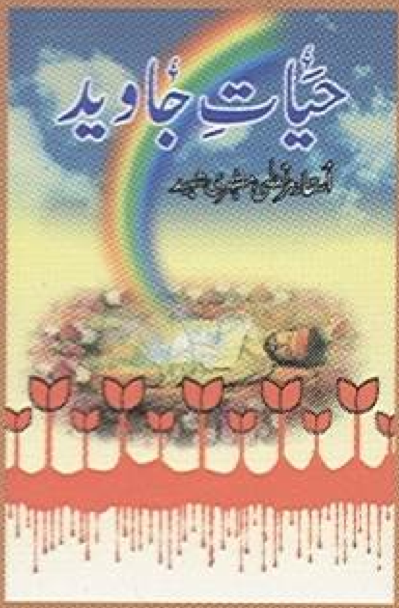

دانش گاہ علوم اسلامی

جی۔پی۔او بکس 10 چکوال پاکستان

0332-3329235 E-mail: payamenoorpub@yahoo.com

Printed By AL-BASIT 021-6606211